فہرست

اداریہ	ابتدا تیرے نام سے	صائمہ اسما	6
انوارِ ربانی	اللہ ایک ہے	اسوہ بتول	8
قولِ نبیؐ	صلہ رحمی	ڈاکٹر میمونہ حمزہ	12
خاص مضمون	کورونا کی وبا اور ہماری ذمہ داریاں	ڈاکٹر فلزہ آفاق	17
نوائے شوق	اگر اس وقت میں ہوتی!	ہاجرہ منصور	25
	غزل	حبیب الرحمٰن	26
حقیقت و افسانہ	کل عید ہے	فرحت نعیمہ	27
	محبتیں جو مل گئیں	قانتہ رابعہ	31
	عرق انفعال	ڈاکٹر میمونہ حمزہ	37
	کنور	حبیب الرحمٰن	42
	خالی صندوق	دانش یار	47
انٹرویو	تزئین حسن سے ایک ملاقات	صائمہ اسما	51
یاد داشتیں	سعودی عرب میں ایک سال	پروفیسر خواجہ مسعود	61
خفتگانِ خاک	میری ماں جی	ڈاکٹر ممتاز عمر	65
مشاہدات	کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر	ڈاکٹر ثمین ذکاء	67
ہلکا پھلکا	قصہ ایک عید ملن کا	قانتہ رابعہ	75
گھر داری	کیا پکائیں؟	بنت شیروانی	78
گوشۂ تسنیم	کورونا کے دن ہیں!	ڈاکٹر بشریٰ تسنیم	80

ابتدا تیرے نام سے

قارئین کرام!

اس بار تو لگتا ہے جانے والوں کا ہی دکھ منائیں گے۔ایک فہرست ہے جس میں ایک سے ایک اپنی صفات میں انوکھا ہے۔اچانک اتنی قابل قدر شخصیات ہمارے درمیان سے چلی گئیں کہ خالی پن کے احساس نے گھیر لیا ہے۔بے وزنی کی کیفیت ہے،کم مائیگی کا کا رونا ہے۔پہلے ہی قحط الرجال کا سامنا ہواس پر مزید کچھ لوگ اٹھ جائیں جن سے بھرم قائم تھا۔کوئی محرومی سی محرومی ہے۔

سید منور حسن سابق امیر جماعت اسلامی جن کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز!دنیا کو ٹھوکر مار کر ایک کونے میں بیٹھ جانا،زہد وورع کی منزلیں طے کرنا آسان،مگر دنیا میں رہتے بستے ہوئے دنیا کو حقیر کیسے سمجھا جاتا ہے،دنیا کو اس کی اوقات پر کیسے رکھا جاتا ہے،یہ ان کے طرز زندگی نے سمجھایا۔سیاست کے اعلیٰ ایوانوں میں پہنچے جہاں بڑے بڑوں کے ایمان،عقیدے،اصول قاعدے ڈول جاتے ہیں،اس شخص نے اپنے دامن پر ایک دھبہ بھی نہ لگنے دیا۔ان کے مرشد سید مودودیؒ آج زندہ ہوتے تو ان کا سر اٹھا ہوتا اپنی ٹیم کے اس ادنیٰ کارکن کو دیکھ کر جس نے خدا کے نام کا حلف اٹھایا تو آخری سانس تک نبھایا۔اسے کہتے ہیں کردار اور اسے کہتے ہیں تربیت! آقاؐ اپنے اس امتی سے کتنے خوش ہوں گے جس نے ان کا امتی ہونے کی لاج ارکھی،اپنی خودی اور خودداری کا پاسبان رہا،امانتوں کا پاسدار رہا جو آقاؐ کی تعلیمات نے دنیا کو سکھایا۔سوچنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ جس گلدستے کا سید منور حسن ایک نمایاں پھول تھے،اس کی امان میں سارا باغ ہو تو کیا ہوائے چمن بدل نہ جائے!ہم سیاست کے نام پر مسخروں،ڈرامہ بازوں، غیر ملکی ایجنٹوں،دنیا کے کتوں سے نجات نہ پا جائیں؟جو جاگیریں،جائیدادیں،فیکٹریاں،ملیں،محلات ہوتے ہوئے بھی اختیارات ملنے پر ایسے بھک منگے، اچکے اور نیچ بن جاتے ہیں جیسے ان کی سات پشتوں میں کسی کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملا۔ملک فقیر ہونے کو ہے مگر ان کی ہوس کے دوزخ بھرنے کو نہیں آتے،اور جو سالہا سال سے ہمارے سروں پہ عذاب بن کر مسلط ہیں۔صدر ایوب کا وہ مکالمہ بہت مشہور ہوا تھا جب انہوں نے مولانا مودودیؒ سے کہا تھا کہ مولانا آپ تو نیک لوگ ہیں آپ اس سیاست کی گندگی میں کہاں کود پڑے؟تو مولانا نے جواب دیا،آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم اس گند کو گند ہی رہنے دیں،صاف نہ کریں؟اور پھر وہ اپنے بے لوث کارکنوں کو لے کر اس گندگی کو چیلنج کرنے کے لیے نکل پڑے۔ان کی ٹیم کا ایک ادنیٰ کارکن اگر سید منور حسن جیسا ہیرا ہے جس نے اس غلاظت میں لتھڑنا تو کیا،اس کا ایک چھینٹا بھی خود پر پڑنے نہیں دیا۔تو پھر پاکستان کا مقدر بھی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں بدلے گا۔وہ تبدیلی جو ایک سراب ثابت ہوئی،کہاں سے آتی کہ ایسے کردار چاہئیں اس کے لیے۔جن کا دل دنیا سے غنی ہو اور نگاہوں میں پرسش کا لمحہ ہر وقت جاگتا رہے۔جنہوں نے مئے توحید ایسی چکھی کہ پھر کوئی مزا انہیں مائل نہ کر سکا۔اپنے زمانے کے مقبول رجحان کے مطابق زمانہ طالبعلمی میں سوشلزم سے متاثر ہوئے مگر جلد ہی ان کی صالح فطرت انہیں اپنے فطری مقام پہ لے آئی۔ان کی اہلیہ ان سے پہلے حلقہ خواتین کی سربراہی پر فائز رہ چکی تھیں اور قومی اسمبلی کی ممبر بھی رہیں۔گھریلو ذمہ داریوں کے معاملے میں پاکستانی مرد حضرات تعاون نہ کریں تو ان کی بیویاں معاشرے میں کوئی فعال کردار ادا نہیں کر سکتیں۔اس اعتبار سے بھی ان کا تعاون مثالی تھا۔آج صرف ان کی اہلیہ اور بچے ان کی شفقت سے محروم نہیں ہوئے بلکہ جماعت اسلامی کا ہر کارکن،معاشرے میں ان کے اعلیٰ کردار و اخلاق کی گواہی دینے والا ہر فرد غمزدہ ہے۔پاکستان کی متعفن سیاست میں تعفن سے نبرد آزما خوشبو کا ایک منبع چلا گیا۔جماعت اسلامی اپنے ابتدائی زمانے کے وقیع سرمائے

سے محروم ہوگئی۔ جو سرتاپا منور تھے، اللہ ان کی قبر کو بھی منور کردے آمین۔

مفتی محمد نعیم بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ بلند پایہ عالم دین اور جامعہ بنوریہ یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ انہوں نے جامعہ کے نصابات میں جدید علوم کو متعارف کروایا اور دینی و دنیاوی علوم کی دوئی کے نتیجے میں ہم جن نقصانات سے دوچار ہیں ان کا سب سے پہلے ادراک کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جامعہ بین الاقوامی طالب علموں کے لیے کشش کا باعث ہے۔ بے حد بالغ نظر عالم تھے اور دین کی روشنی میں معاملات کی متوازن اور عملی تعبیر پیش کرتے تھے۔ ایسے دور میں جبکہ دین کے نام پر کئی فتنے سر اٹھائے کھڑے ہیں، مفتی نعیم جیسے عالموں کا اٹھ جانا بڑی محرومی ہے۔ علامہ طالب جوہری بھی خالق حقیقی سے جا ملے۔ عالم دین، سحر البیان مقرر، شاعر، تاریخ و فلسفہ دان تھے۔ علامات ظہور مہدی اور حدیثِ کربلا سمیت کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ایک وقت تھا کہ محرم الحرام کی مجالس میں ان کی تقاریر ٹی وی سے ہر سال نشر کی جاتی تھیں۔

پاکستان کے معروف اور ہر دلعزیز صداکار، آرٹسٹ طارق عزیز بھی رخصت ہوئے۔ آخری وقت تک نہایت فعال زندگی گزاری۔ ہجرت کرکے پاکستان آئے تھے تو پاکستان کو ایمان کا حصہ بنائے رکھا۔ نیلام گھر شو کے ذریعے تین نسلوں کو معیاری تفریح مہیا کی۔ آج الیکٹرونک میڈیا پر بھانڈوں میراثیوں اور نقلی دانشوروں کا ہجوم دیکھ کر ہمیشہ طارق عزیز جیسے باوقار، باذوق، لائق، وضع دار، مہذب لوگوں کی یاد آئے گی جن کی شعر و ادب سے سجی ہوئی گفتگو سننے والوں کو گھنٹوں مسحور رکھتی تھی۔ جو تفریح کو تہذیب، وقار اور تربیت سے جدا نہ کرتے تھے۔ جو نیلام گھر جیسے شو میں انعامات دیتے تھے مگر چند ٹکوں کے لیے انسانوں کو ذلیل ہونے پر آمادہ نہیں کرتے تھے۔ لوگوں کو مال کی حرص میں مبتلا کرنے کے لیے دکان نہیں سجاتے تھے۔ معلومات عامہ، شعر و شاعری اور معاشرے کی نمایاں شخصیات سے متعارف کروانا ان کے شو کا لازمی حصہ تھا۔ خود شاعر تھے اور پنجابی میں لکھے ہوئے کلام کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ پاکستان کے ثقافتی و ادبی منظر نامے میں ان کی کمی بے طرح محسوس کی جائے گی۔

ماہر ابلاغیات ڈاکٹر مغیث الدین شیخ بھی چلے گئے۔ پاکستان میں میڈیا کے پھیلاؤ کے بعد اس شعبے میں تحقیق کا معیار بڑھانے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ اس کے بعد متعدد نجی یونیورسٹیوں کے متعلقہ شعبے قائم کیے اور چلائے۔ اس وقت صحافت، ابلاغ عامہ اور تعلیمی اداروں سے منسلک ان گنت ماہرین، پریکٹشنرز اور اساتذہ کے وہ رہنما اور استاد رہے۔ اپنے شعبے میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ ایک اچھے انسان کے ساتھ ابلاغ عامہ کے علم و فن کے اعتبار سے ان کا جانا ایک نقصان عظیم ہے۔ آخر میں معروف شاعر ناصر زیدی کے انتقال کی خبر بھی مل گئی۔ خوبصورت کلام کے خالق، ادب لطیف کے مدیر رہے۔ شعری مجموعوں کے ساتھ علامہ اقبال اور قائداعظم پر بھی کتب تصنیف کیں۔

اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کی مغفرت کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے آمین۔ کورونا سے بہت گھرانوں کے چراغ بجھے ہیں اور ابھی تک یہ بلا ٹلتی نظر نہیں آرہی۔ وہ سب جو وبا کا شکار ہوئے اور جاں بر نہ ہو سکے رب العزت سے ان کے لیے بھی مغفرت اور بلندی درجات کی دعا ہے۔ اللہ ان کے لواحقین کو صبر جمیل دے آمین۔

مقبوضہ وادی میں ایک تین سالہ بچے کی اس کے شہید نانا کے ساتھ تصویر نے تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ بھارتی حکومت کی مسلمانوں کے لہو کی پیاس بڑھتی چلی جارہی ہے۔ ایک وحشیانہ پن ہے جس کے مظاہرے ہر روز کسی نہ کسی شکل میں ہوتے ہیں۔ مظلوم کشمیریوں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں حتیٰ کہ ہم نے بھی جن کا وہ پرچم لہراتے ہیں، آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ پہلے یوں لگتا تھا جیسے بھارت اور چین کے لداخ تنازعہ کے پس منظر میں کوئی ایسا بندوبست ہونے جارہا ہے جس کے نتیجے میں مقبوضہ وادی کی بھی قسمت کھلے گی اور اسے بھارت کے شکنجے سے رہائی دلوانے پر کوئی پیش رفت ہوگی لہٰذا مصلحتاً اس وقت خاموشی بہتر ہے۔ مگر اب سید علی گیلانی کی حریت کانفرنس سے علیحدگی بہت سے سنگین سوالات اٹھا رہی ہے۔ پاکستان اپنے اندرونی مسائل سے مہلت پائے تو ان

معاملات پر کچھ کرے۔ فی الوقت تو ہر ادارے کی تباہی نظر آ رہی ہے۔ طیارہ حادثہ انکوائری میں وزیر ہوابازی نے ایک اور گل کھلا دیا ہے، پی آئی اے کا رہا سہا وجود بھی اب ختم ہونے کو ہے۔ حکومت معاملات سنبھالنے میں ناکام نظر آتی ہے۔ اہم عہدوں پر ناکارہ لوگ براجمان ہیں۔ اللہ ہمارے حال پہ رحم کرے اور اس قوم کو مخلص اور اہل حکمران عطا کرے جو معاملات کی سمجھ بوجھ بھی رکھتے ہوں اور قوم کی امانتوں کے بارے میں خدا سے بھی ڈرتے ہوں۔

ناصر زیدی مرحوم ہی کے چند اشعار درج ہیں۔

پھول صحرا میں کھلا دے کوئی

میں اکیلا ہوں صدا دے کوئی
کوئی سناٹا سا سناٹا ہے
کاش طوفان اٹھا دے کوئی
جس نے چاہا تھا مجھے پہلے پہل
اس ستم گر کا پتا دے کوئی
جو مرے پاس بھی ہے دور بھی ہے
کس طرح اس کو بھلا دے کوئی
دل کے خرمن میں نہاں ہیں شعلے
اپنے دامن کی ہوا دے کوئی
پھول پھر زخم بنے ہیں ناصرؔ
پھر خزاؤں کو دعا دے کوئی

عیدالاضحیٰ کی مبارکباد کے ساتھ اجازت دیجیے اگلے ماہ تک بشرطِ زندگی۔

صائمہ اسما

ڈاکٹر میمونہ حمزہ

صلہ رحمی

انسانی معاشرے میں خاندان ایک بنیادی اکائی ہے۔ انسانی نفوس میں اللہ کا تقویٰ ہی وہ بنیاد ہے جو انسانوں کو باہم جوڑ کر ایک مستحکم سوسائٹی برپا کرتا ہے۔ ایک دوسرے سے محبت، ضرورت پڑنے پر مدد، اور باہم پشتیبانی انسانی معاشرے کی شیرازہ بندی کرتے ہیں۔ خاندان کی تنظیم کے اصولوں میں، کنبے میں شامل تمام افراد کو باہم جوڑنے، ان کا احترام کرنے، اور ان کے حقوق ادا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسلامی معاشرے کی ذہنی و اخلاقی تربیت میں اور مسلمانوں کے آدابِ تہذیب میں والدین کے ادب اور اطاعت اور قرابت داروں کے حقوق کی نگہداشت کو ایک اہم عنصر کی حیثیت سے شامل کیا گیا ہے۔ اور ان چیزوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ اصول طے کر دیا کہ اسلامی ریاست اپنے قوانین اور انتظامی احکام اور تعلیمی پالیسی کے ذریعے سے خاندان کے ادارے کو مضبوط اور محفوظ بنانے کی کوشش کرے گی نہ کہ اسے کمزور بنانے کی۔ اسلام کی یہ تعلیمات محض انفرادی اخلاقی تعلیم ہی نہیں، بلکہ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست انہیں بنیادوں پر استوار کی گئی تھی، اور معاشرے کا اخلاقی نظام عملاً ایسا بنایا گیا، کہ اجتماعی ماحول میں فیاضی، ہمدردی اور تعاون کی روح جاری وساری ہوگئی۔

صلہ رحمی کے لغوی معنی

عربی زبان میں ''صلۃ'' کا مادہ ''وصل'' ہے، اور صلہ کا جمع صلات ہے جس کے کئی معنی ہیں، جیسے: وہ شے جو کسی کو دی جائے، انعام، نیکی اور احسان بھی صلہ کہلاتا ہے۔ صلہ دو یا زیادہ چیزوں کو ملانے اور جمع کرنے کو بھی کہتے ہیں (معجم المعانی)۔ رحم لغوی طور پر ماں کے پیٹ میں استقرارِ جنین کے مقام کو کہتے ہیں، جو رشتے اور قرابت کا سبب ہے۔ اسی لیے رشتہ داروں کے لیے ذو الارحام اور ذوی القربیٰ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

رحم، عربی زبان میں قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتہ دار، خواہ دور کے ہوں یا قریب کے، اس کے ذوی الارحام ہیں۔ جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو، اس کا حق آدمی پر اتنا ہی زیادہ ہے، اور اس سے قطع رحمی کرنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلہ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو، اس سے دریغ نہ کرے۔ اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ برا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اس کے لیے ممکن ہو، اس سے قصداً پہلو تہی کرے۔ (تفہیم القرآن، ج ۵، ص ۲۶)

صلہ رحمی کے اصطلاحی معنی

شرعی اصطلاح میں صلہ رحمی ایسے رشتوں کے اجتماع کو کہا جاتا ہے جن کا باہم نکاح حرام ہو۔ اس طرح ننھیال اور ددھیال کے ماموں زاد اور چچا زاد رحم کے رشتوں میں شامل نہیں ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق رحم کے رشتوں سے مراد وہ رشتے ہیں جو میراث میں شریک ہیں۔ اور دوسری رائے میں خواہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہوں یا نہ ہوں، قرابت کے لحاظ سے صلہ رحمی کی حد میں شامل ہیں۔ یہ امر نہایت پسندیدہ ہے کہ بندہ اپنے نسبی اور سسرالی رشتوں کے ساتھ احسان کا رویہ اختیار کرے، خواہ میل جول کے ذریعے سے، یا ان کی مالی مدد کر کے یا ان کی خدمت کر کے، انہیں مشورہ دے کر، اور کبھی نصیحت کر کے، کبھی مسکرا کر اور کبھی خندہ پیشانی سے بات کر کے ان کا حق ادا کرے۔ اور اگر ان کی جانب سے درشت روی، یا رکھائی برتی جائے تو بھی وہ اپنا حسنِ عمل ترک نہ کرے۔

صلہ رحمی وہ عظیم اصول ہے جس پر پوری زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اس کے وجوب میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے

قرآن کریم میں اس بارے میں واضح ہدایات دی ہیں؛ فرمایا:

۱۔''اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حق مانگتے ہو، اور رشتہ وقرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے''۔(النساء،۱)

ارحام سے مراد رحمی رشتے ہیں،اس کو اللہ پر عطف کر کے اس کی وہ اہمیت بیان کی گئی ہے جو دین میں ہے۔اس سے معلوم ہو کہ خدا کہ بعد وہ پہلی چیز جو تقویٰ اور احترام کی سزاوار ہے وہ رشتہء رحم اور اس کے حقوق ہیں۔خدا سب کا خالق ہے اور رحم سب انسانوں کے وجود میں آنے کا واسطہ اور ذریعہ ہے۔اس لیے خدا اور رحم کے حقوق سب پر واجب ہیں۔اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے رحم کا یہ درجہ رکھا ہے کہ جو اس کو جوڑتا ہے خدا اس سے جڑتا ہے اور جو اس کو کاٹتا ہے خدا اس سے کٹتا ہے۔(تدبّر قرآن، ج ۲،ص ۲۴۶)

۲۔''رشتہ دار کو اس کا حق دو اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق''۔ (الاسراء،۲۶)

۳۔''ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے،انہیں برقرار رکھتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے''۔(الرعد،۲۱)

صلح رحمی کا متضاد قطع رحمی ہے،جس کو ناپسندیدہ خصلت قرار دیا گیا،ارشاد ہے:

''اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو تم زمین میں پھر فساد برپا کر دو اور اپنے رشتے ناتے توڑ ڈالو؟''(محمد،۲۲)۔

''پس قرابت دار،مسکین اور مسافر کو ان کے حقوق دو۔ یہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور یہی کامیاب لوگ ہیں''۔(الروم،۳۸)

''اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے سامنے بھلے مانسوں کی سی بات کرو''۔(النساء۸)

اسلام میں قطع رحمی حرام ہے۔اور صلہ رحمی کو متعدد مقامات پر رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کو بڑی نیکیوں میں شمار کیا گیا ہے۔حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا:''جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے،اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے''۔(رواہ البخاری،۶۱۳۸) گویا صلہ رحمی اللہ اور آخرت پر ایمان کے ثمرات میں سے ہے۔

رسول کریمؐ نے فرمایا،کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں:

''میں رحمٰن ہوں،اور رحم (رشتہ) کو میں نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ جو اسے جوڑے گا میں اسے جوڑ دوں گا،اور جو اسے کاٹے گا میں اسے کاٹ دوں گا''۔(سنن ابوداؤد۱۶۹۴؛الترمذی،۱۹۰۷)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:''جسے پسند ہو کہ اللہ اس سے محبت کرے اور اس کے رزق میں وسعت عطا کرے،اور اس کی عمر میں برکت دے،تو اسے چاہیے کہ صلہ رحمی کرے''۔(رواہ البخاری،۵۹۸۶)

قطع رحمی کرنے والے کا گناہ

جبیر بن مطعم نے خبر دی،کہ انہوں نے رسول اللہؐ سے سنا،آپؐ نے فرمایا:''قاطع رحم جنت میں داخل نہ ہوگا''۔(رواہ البخاری،۵۹۸۴)

رشتہ ناطہ توڑ دینا یا رشتہ داری کا پاس ولحاظ نہ کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بے حد مبغوض ہے،رسول خداؐ نے فرمایا:''قیامت کے دن رحم (جو رشتہ داری اور تعلق کی بنیاد ہے) عرش الٰہی پکڑ کر کہے گا،کہ جس نے مجھے دنیا میں جوڑے رکھا،آج اللہ تعالیٰ بھی اسے جوڑے گا (یعنی اسے انعام و اکرام عطا کرے گا) اور جس نے مجھے (دنیا میں) کاٹا اسے آج اللہ بھی کاٹ کر رکھ دے گا (یعنی سزا دے گا)۔(رواہ البخاری،۵۹۸۹)

احادیث سے ثابت ہے کہ دنیا میں دو گناہ ایسے ہیں جن کی آخرت کی سزا کے ساتھ دنیا میں بھی سزا ملے گی:ایک ظلم اور دوسرے قطع رحمی۔(ابن ماجہ،۴۲۱۱)

صلہ رحمی کے فضائل

صلہ رحمی کرنے والے کو دنیا و آخرت دونوں میں بھلائیاں ملتی ہیں،جیسے:

صلہ رحمی دخولِ جنت کا ذریعہ ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: ''کوئی نیکی ثواب میں صلہ رحمی سے زیادہ نہیں ہے، اور نہ ہی کوئی گناہ ایسا ہے کہ اللہ اس کے کرنے والے کو دنیا میں جلد سزا دے، اور اس کے بعد آخرت کا عذاب بھی ہوگا، سوائے سرکشی اور قطع رحمی کے''۔ (رواہ الترمذی، ۲۵۱۱)

صلہ رحمی گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ

ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا: ''اے اللہ کے رسولؐ میں نے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ کیا میری مغفرت ہوسکتی ہے؟ آپؐ نے پوچھا: کیا تیری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے پوچھا: اور خالہ؟ اس نے کہا: وہ زندہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: پس ان سے نیکی کر''۔ (رواہ الترمذی، ۱۹۰۴) اس سے معلوم ہوا کہ بڑے گناہ کا صدور ہو جائے تو بڑی نیکیاں ان کے مٹانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اور گناہ کے بوجھ میں دبے ہوئے شخص کو صلہ رحمی کے ذریعے مغفرت کی امید دلائی گئی۔ ماں کی خدمت کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے تو خالہ سے حسنِ سلوک بھی مغفرت کا ایک دروازہ ہے۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے خالہ کے بارے میں بتایا: ''یہ ماں کے قائم مقام ہے''۔ (متفق علیہ)

ایک اور جگہ فرمایا: ''مسکین کو خیرات دینا صدقہ ہے، اور رشتہ دار کو دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی''۔ (سنن النسائی، ابن ماجہ و الترمذی، حدیث حسن)

حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ نے بیان کیا کہ ان کی مشرکہ والدہ ان سے ملنے آئیں اور وہ ان سے کچھ مال چاہتی تھیں، تو میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا، کیا میں ان سے صلہ رحمی کرسکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں''۔ (رواہ البخاری، ۵۹۷۸؛ سنن ابی داؤد، احمد)

اضافہ عمر

حضرت ابنِ عمرؓ فرماتے ہیں: جو اپنے رب سے ڈرے اور صلہ رحمی کرے تو اس کی عمر میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور اس کا مال کثیر اور اس کے اہل میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے۔

کعب بن احبار فرماتے ہیں: قسم اس ذات کی کہ جس نے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے لیے سمندر پھاڑا، تورات میں یہ لکھا ہوا ہے: اپنے رب سے ڈر، اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کر، تیری عمر دراز ہوگی، تیرا معاملہ آسان ہوگا اور تیری مشکل ٹل جائے گی۔

آپؐ کا ارشاد ہے: ''صلہ رحمی کرو اگرچہ سلام کے ساتھ ہو''۔ (مجمع الزوائد ۸۔۱۵۲)

قطع رحمی کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے اور امام قرطبیؒ اور قاضی عیاضؒ کا اس پر اجماع ہے، اگرچہ صلہ رحمی کی تفصیلات میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور یہ صلہ رحمی کرنے والے اور اس کے متعلقین کے حالات کے حوالے سے ہے، ممکن ہے کہ صلہ رحمی کرنے والا تنگ دست ہو، یا وہ جن سے صلہ رحمی کرنا چاہتا ہے وہ خوش حال ہوں اور انہیں اس کے مال کی حاجت نہ ہو، تو ایسی صورت میں ان سے رابطہ رکھنے اور انہیں سلام کرنے اور ان سے ملاقات کرنے اور خدمت اور خیر خواہی ہی کو صلہ رحمی شمار کیا جائے گا۔ اور اگر مالدار کے ذوالارحام تنگ دست ہیں تو اسے ان کی مالی مدد بھی کرنی ہوگی۔

عرش کے سائے تلے

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں: تین قسم کے لوگ اللہ کے عرش کے سائے تلے ہوں گے:

۱۔ صلہ رحمی کرنے والا، اس کی عمر بھی لمبی کر دی جاتی ہے، اور رزق کشادہ کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ وہ عورت کہ جس کا شوہر یتیم بچے چھوڑ کر مر جائے، پھر وہ ان کی پرورش کرتے کرتے انہیں مالداری تک پہنچا دے یا وہ مر جائیں۔

۳۔ وہ شخص جو یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

حضرت حسنؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: دو قدم ایسے ہیں جن کے چلنے سے اللہ خوش ہوتا ہے: ۱۔ فرض نماز کی طرف، ۲۔ قریبی رشتہ دار کی طرف۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: تین صفات ایسی ہیں وہ جس شخص میں بھی ہوں اللہ اس سے آسان حساب لے گا اور اسے جنت میں داخل کرے گا۔ صحابہ اکرامؓ نے پوچھا: کن

(صفات والوں) کو؟ آپؐ نے فرمایا: جو تجھے محروم کرے اسے عطا کر، جو تجھ پر ظلم کرے اسے معاف کر، اور جو تجھ سے (رشتہ داری اور تعلق) توڑے، تو اس سے جوڑ۔ صحابیؓ نے پوچھا: اگر میں ایسا کروں تو مجھے کیا ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: تجھ سے آسان حساب لیا جائے گا اور تجھے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جنت میں داخل کردے گا''۔ (مستدرک علی صحیحین، ۳۸۴۲)

حضرت عمرو بن شعیبؒ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور شکایت کی کہ میرے کچھ قریبی رشتہ دار ہیں جو میرے ساتھ قطع رحمی کرتے ہیں، میں معاف کرتا ہوں اور وہ مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔ میں ان سے حسنِ سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدخوئی کرتے ہیں، کیا میں انہیں اس کا بدلہ دوں؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ تب تو تم سب ایک سے ہو جاؤ گے، لیکن فضیلت حاصل کر اور صلہ رحمی کر، اللہ کی جانب سے تیرا ہمیشہ مددگار مقرر رہے گا جب تک تو اسی حالت پر رہے گا''۔ (رواہ مسلم، ۲۵۵۸)

خدا اور رحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاون اور ہمدردی کا محرک رہا ہے۔ انسان عمومی طور پر مشکل وقت میں انہیں دو چیزوں کے ذریعے لوگوں کے دل نرم کرتے کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فطری پکار ہے اور عموماً موثر بھی ثابت ہوتی ہے، لیکن یہ تعلق دوطرفہ ہے۔ یہ نہیں کہ ایک فریق ضرورت کے وقت اسی پکار پر لوگوں کے دل پگھلائے، لیکن جب کوئی دوسرا اسے پکارے تو وہ اللہ اور رحم کے تعلق کی پرواہ نہ کرے۔ ایسے شخص کو امین احسن اصلاحی خدا سے دھوکا بازی اور رحم سے بے وفائی کا مجرم قرار دیتے ہیں، اور اس جرم کا ارتکاب وہی کرسکتا ہے جس کا دل اللہ کے تقویٰ سے خالی ہے۔ حق طلبی اور حق شناسی کا توازن یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور رحم کا نام لے کر دوسروں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، وہ ان کے نام پر طلب کرنے پر ان کی ذمہ داریاں بھی اٹھائیں۔ اور یہی اسلامی معاشرے کا اصلی جمال ہے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو خدا خوفی کی دعوت دیتے ہیں، اللہ کی وہ خشیت جس کے نام پر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، کہ وہ باہم تعلقات میں صلہ رحمی کا خیال رکھیں۔ یعنی آپس کے روابط، تعلقات، رشتہ داریوں اور باہمی معاملات میں خدا خوفی کا طرزِ عمل اختیار کرو۔ ان تعلقات کے بارے میں اپنے احساس کو تیز کرو، ان کے حقوق کا احساس کرو، ان میں ظلم سے بچو۔ ان کو چھونے اور خراش لگانے سے بچو۔ رشتہ میں اذیت نہ دو، رشتہ داروں کے جذبات مجروح نہ کرو، نہ ان کے حقوق تلف کرو۔ رشتہ کو محبت دو اور رشتہ کے سائے میں رہو۔ اختتام اللہ کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ (فی ظلال القرآن، تفسیر النساء)

صلہ رحمی رسول اللہؐ کی تعلیمات کا بنیادی حصّہ تھیں، جب آپؐ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے پر گھبرا گئے اور غارِ حرا کا واقعہ حضرت خدیجہؓ کو بیان کیا تو آپؓ نے جن اوصاف کا ذکر کرکے کہا کہ اللہ آپؐ کو ضائع نہ کرے گا، ان میں صلہ رحمی کا بھی ذکر تھا۔ اسی طرح جب رسول اللہؐ نے ہرقل کو دعوتِ اسلام قبول کرنے کے لیے خط لکھا تو اس نے تجارتی قافلے کے ہمراہ آنے والے ابوسفیان کو اپنے دربار میں بلالیا اور اس سے نبی کریمؐ کی تعلیمات کے بارے میں سوال کیا، کہ وہ تمہیں کس چیز کا حکم دیتے ہیں؟ یعنی النبیؐ۔ تو اس نے کہا: وہ ہمیں نماز، اور صدقہ کرنے، پاکدامنی اختیار کرنے اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں''۔ (رواہ البخاری، ۵۹۸۰)

رسول اللہؐ نے جب دعوتِ دین کی تبلیغ کی تو اس کی ابتدا بھی اپنے کنبے سے کی، قرآنِ کریم میں آپ کو حکم دیا گیا:

''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ''۔ (الشعراء، ۲۱۴)

معتبر روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپؐ نے سب سے پہلے اپنے دادا کی اولاد کو خطاب فرمایا اور ایک ایک کو پکار کر صاف کہہ دیا کہ ''اے بنی عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیّہ رسول اللہ کی پھوپھی! اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی! تم لوگ آگ کے عذاب سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرلو، میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا، البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو''۔ (رواہ البخاری، ۲۷۵۳)

قرابت داروں کو نصیحت صلہ رحمی کا بدرجہ اولیٰ حق ہے۔

رسول اللہؐ نے جب صفا کے بلند مقام سے تمام قرابت دار قبائل کو نام بنام پکارا تو انہیں ان الفاظ میں نصیحت کی: ''اچھا تو میں خدا کا سخت عذاب آنے سے قبل تم کو خبردار کرتا ہوں۔ اپنی جانوں کو اس کی پکڑ سے

بچانے کی فکر کرو۔ میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ قیامت میں میرے رشتہ دار صرف متقی ہوں گے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے لوگ نیک اعمال لے کر آئیں اور تم دنیا کا وبال سر پر اٹھائے ہوئے آؤ۔ اس وقت تم پکارو گے: ''یا محمد!'' مگر میں مجبور ہوں گا کہ تمہاری طرف سے منہ پھیر لوں۔ البتہ دنیا میں میرا تمہارا خون (رحم) کا رشتہ ہے اور یہاں میں تمہارے ساتھ ہر طرح کی صلہ رحمی کروں گا''۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد، ترمذی، نسائی)

اللہ تعالیٰ کے دین کے داعیوں کو بھی نصیحت کرتے ہوئے اس ترتیب کو پیش نظر رکھنا چاہیے، کہ سب سے پہلے خود اس دین کی نصیحت پر کان دھرے اور پھر اپنے قریبی لوگوں کو یہ ڈراوا دے، کیونکہ جو چیز نافع ہے وہ سب ہی کے لیے نافع ہے۔ اور یہ دعوت کا اخلاص بھی ہے۔ اور اگر رشتہ دار اس دعوت کو قبول کر لیں تو ان کے ساتھ نرمی اور ملاطفت اور تواضع کا رویہ اختیار کرو اور جو نہ مانیں ان سے اعلانِ برأت کر دو۔ انہیں خبر دار کر دو کہ تم ان سے بری الذّمہ ہو۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: ''جس کا عمل اسے پیچھے (سست) کر دے، اس کا نسب اسے آگے نہیں کر سکتا''۔ (رواہ مسلم)

رسول اللہؐ کا سگا چچا ابولھب اتنے قریبی تعلق کے باوجود عزت کی منزلت نہ پا سکا، اور اس پر انتہائی سخت الفاظ میں لعنت کی گئی اور رحم کا رشتہ بھی اس کے کام نہ آیا۔

قرآنِ کریم میں کم از کم نو (۹) مقامات پر قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ پوری امتِ مسلمہ صلہ رحمی کی اہمیت پر متفق ہے، اور ہر معاشرے میں قطع رحمی کو برائی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ رحم کا تعلق فرش سے نہیں بلکہ عرش سے ہے، رحم کے رشتے بھی اسی نے بنائے اور ان کو اپنی صفتِ رحمان سے منسلک کیا، اور ان میں باہم محبت قائم کی۔ صلہ رحمی سے دنیا میں خیر و برکت ملتی ہے، اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ اہم سوال ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر فلزہ آفاق [1]

کورونا کی وبا اور ہماری ذمہ داریاں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس طرح زندگی کے ہر پہلو میں ہماری رہنمائی فرمائی ہے اس طرح ہمیں یہ بھی بتادیا ہے کہ کسی آزمائش کی صورت میں ہماری کیا سوچ اور کیا عمل ہونا چاہیے۔ کس طرح ہمیں اس سے صبر اور شکر کے ساتھ گزرنا ہے اللہ تعالیٰ ہم سے کہتے ہیں۔

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر اور نماز سے مدد لو، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ انہیں خوشخبری دے دو کہ ان پر ان کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں''۔ (البقرہ 157-153)

زندگی اور موت کا درمیانی عرصہ تو دراصل امتحان کی مدت ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھیں کہ ہم میں سے کون احسن عمل کرنے والا ہے، سورہ ملک میں اللہ تعالیٰ نے زندگی کا مقصد وضاحت سے بتایا ہے کہ زندگی میں پیش آنے والے حالات وواقعات سے دراصل ہمیں آزمایا جاتا ہے۔

دنیا میں طالب علم امتحانات کیوں دیتے ہیں؟ اسی لیے کہ پاس ہو کر اپنی منزل کو پاسکیں۔ اپنا درجہ بڑھا سکیں۔ تو زندگی کا یہ امتحان بھی درجے بڑھانے اور اپنی اصل منزل..... اللہ کی رضا کو پانے کے لیے ہے۔ جس طرح پرچے کے مشکل سوال زیادہ محنتی اور قابل طالب علم کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں اسی طرح آزمائش بھی انسان کو کندن بنانے کے لیے آتی ہے۔ گو آزمائش کی تمنا نہیں کرنی چاہیے کہ ہم اس کے قابل نہیں مگر مشکل حالات سے واسطہ پڑ ہی جائے تو صبر اور شکر کے ساتھ ان کو گزارنا، اجر کے در کھول سکتا ہے۔ سورہ بقرہ کی ان آیات میں تو صبر اور نماز سے مدد لینے والوں کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔

مومن کے لیے تو ہر حال میں خیر ہی خیر ہے اور ہر تنگی کے ساتھ اللہ نے فراخی بھی رکھی ہے، بس اس فراخی کو تلاش کرنا ہمارا کام ہے۔

کورونا وائرس کی موجودہ وبا جسے covid-19 کا نام دیا گیا ہے (یعنی کورونا وائرس کی وہ وبا جو 2019 میں ظاہر ہوئی) اس کا جراثیم SARS COV-2 سے مختلف ساخت اور صفات رکھتا ہے۔ اس کا بیرونی خول ایک تاج کی طرح RNA کے گرد موجود ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک انوکھی تخلیق ہے جو ہمیں متوجہ کرتی ہے کہ مقتدرِ اعلیٰ اللہ ہی کی ذات ہے جس کی ایک ادنیٰ مخلوق بھی ہماری پوری زندگی کو زیروزبر کرسکتی ہے۔ اگر اللہ ایسا چاہے اور اللہ ہی اس کے شر سے ہماری حفاظت کرسکتا ہے۔ یہ نیا وائرس، کورونا وائرس کے جینیاتی مواد میں تبدیلی کی صورت میں ظاہر ہوا عموماً ایسے تبدیل شدہ وائرس باقی نہیں رہتے لیکن اگر رہ جائیں تو خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ ابتدا میں اس وائرس سے فلو کے وائرس کی طرح کی علامات ظاہر ہوتی ہیں مگر حقیقتاً یہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ فلو ایک فرد سے دوسرے میں جلدی پھیلتا ہے، اس کی علامات جلدی ظاہر ہوتی ہیں اور اس سے اموات کی شرح 0.1 فی صد سے کم ہوتی ہے۔ جبکہ کووڈ 19 کی علامات 2 سے 14 دن اور اوسطاً 5 دن کے عرصے میں ظاہر ہوسکتی ہیں، زیادہ لوگوں میں پھیلتی ہیں اور شرح اموات اوسطاً 3 سے 4 فیصد ہے جبکہ 6 فیصد بھی دیکھا گیا ہے۔

اچھی بات یہ ہے کہ اسی فیصد لوگوں میں یا تو کوئی علامات نہیں ہوتیں یا معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ 15 فیصد لوگوں کو سانس لینے

[1] نگران ریلیف پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن شعبہ خواتین پنجاب

میں دشواری اور آکسیجن کی ضرورت پڑ سکتی ہے ۔5 فیصد مریضوں کو مصنوعی طریقے سے سانس (ventilation) دینے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ان 5 فیصد میں شرح اموات زیادہ ہے۔

2002 میں جو وبا SARS (severe acute respiratory syndrome) کے نام سے پھیلی تھی ، اس میں شرح اموات زیادہ تھی مگر اس سے نسبتاً کم لوگ متاثر ہوئے۔

علامات

covid-19 کی عمومی علامات میں بخار (جو پہلے ہلکا اور پھر تیز ہو سکتا ہے) خشک کھانسی اور تھکاوٹ شامل ہیں۔ان کے علاوہ دیگر علامات بھی ظاہر ہو سکتی ہیں، مثلاً گلے میں درد، آنکھوں میں سوزش، نزلہ، سر درد، جسم میں درد، متلی یا اُلٹی آنا، پتلے موشن ڈائریا، ذائقے/اور سونگھنے کی حس کا ختم ہونا ، جسم میں سرخی ، ہاتھ یا پاؤں کی انگلیوں کا رنگ بدلنا ۔زیادہ تشویشناک علامامت میں سانس میں دشواری ، سینے میں درد یا دباؤ میں دشواری یا جسم کے کسی حصے میں اچانک کمزوری، غنودگی، ہونٹوں کا نیلا پن شامل ہیں ۔بعض اوقات کرونا دل یا دماغ کی بیماری کی صورت میں بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

علامات کی موجودگی میں ڈاکٹر سے مشورہ کریں تا کہ ٹیسٹ اور ہسپتال جانے کے بارے میں آپ کو رہنمائی دی جا سکے ۔جیسا کہ پہلے ذکر ہؤا ہے 80 فیصد لوگوں میں علامات نہیں ہوتیں یا معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں اور وہ گھر پر ہی بہتر ہو جاتے ہیں۔ بیماری پر شروع کے مراحل میں قابو پانا آسان ہوتا ہے۔

علامات کے ضمن میں انڈس ہسپتال والوں نے ایک ایپ بنائی ہے جس میں آپ اپنی علامات لکھیں تو آپ کو بتا دیا جاتا ہے کہ کورونا ہونے کے کتنے امکانات ہیں اور آپ کو کیا کرنا ہے۔

اس کے علاوہ حکومت کی طرف سے ہیلپ لائن موجود ہے ، PIMA (پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن) کی telemedicine کی سروس موجود ہے جہاں فون پر رہنمائی دی جاتی ہے۔ کچھ اور ادارے بھی اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں مثلاً cured کے نام سے ایک این جی او ڈاکٹروں نے بنائی ہے جو فون پر رہنمائی اور بعض جگہوں (لاہور میں) home service دے رہی ہیں ہیلپ لائن آپ کو یہ بھی بتاتی ہے کہ ہسپتال آنے کی ضرورت پڑے تو آپ کو کہاں جگہ مل سکتی ہے۔ملک گیر تنظیم الخدمت بھی اس سلسلے میں بہت کام کر رہی ہے اور ایمرجنسی سروس دے رہی ہے۔ایسے نمبر گھر میں موجود ہونے چاہئیں تا کہ ضرورت پڑنے پر دقت نہ ہو۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق وائرس بڑی عمر کے لوگوں ، وہ لوگ جن کی قوت مدافعت کم ہو یا کسی اور بیماری کا شکار ہوں ۔انہیں زیادہ متاثر کرتا ہے۔

covid19 کی بیماری کیسے پھیلتی ہے؟

نظامِ تنفس کی کسی بھی بیماری کی طرح یہ بھی گلے اور ناک کی رطوبت سے پھیلتی ہے، جو مریض کے بات کرنے ، کھانسنے یا چھینکنے سے 6 فٹ کے فاصلے تک دوسروں تک پہنچ سکتی ہے اور منہ، ناک اور آنکھوں کے ذریعے جسم میں داخل ہو سکتی ہے۔اس کے علاوہ ہاتھوں سے بے جان چیزوں پر بھی منتقل ہو سکتی ہے۔

یہ وائرس پلاسٹک پر 3-2 دن، ٹین لیس سٹیل 3-2 دن اور کارڈ بورڈ پر ایک دن تک موجود رہ سکتا ہے۔اگر ان چیزوں پر وائرس موجود ہو اور ان کو چھونے کے بعد منہ، ناک یا آنکھوں کو ہاتھ لگایا جائے تو وائرس جسم میں منتقل ہو سکتا ہے۔

کیا یہ وائرس ہوا کے ذریعے دُور تک پھیل سکتا ہے؟ اس پر تحقیق جاری ہے۔خیال ہے کہ اگر تیز ہوا کا رخ ایسا ہو کہ وہ وائرس کو پھیلا سکے تو یہ ممکن ہے۔اس کے علاوہ ہسپتالوں میں جہاں مریضوں کو مصنوعی سانس دیا جا رہا ہو یا سانس کے لیے نالی لگائی یا نکالی جا رہی ہو، اس طرح کے عمل سے وائرس ہوا میں پھیل سکتا ہے اور کچھ دیر موجود رہ سکتا ہے۔اسی طرح ہسپتال کے فرش پر بھی وائرس پھیل سکتا ہے اس لیے بار بار senitization کی ضرورت پڑتی ہے۔

کورونا وائرس انسانی جسم میں کیا کرتا ہے؟

کورونا وائرس جسم میں 3 مراحل سے گزر سکتا ہے ابتدا میں یہ

وائرس ناک کے پچھلے حصے یا گلے کے اوپر والے حصے Nasopharynx میں ٹھہرتا ہے اور فلو کی طرح کی علامات، بخار، کھانسی، تھکاوٹ ظاہر ہوسکتی ہیں یا ظاہر نہیں ہوتیں۔ اگر انسانی جسم صحت مند ہو، قوت مدافعت درست کام کر رہی ہو تو یہ یہیں ختم ہوسکتا ہے۔

دوسرے مرحلے میں یہ سانس کی بڑی نالیوں میں پہنچتا ہے اور سانس میں دشواری شروع ہوسکتی ہے، قوت مدافعت کم ہو تو کچھ اور جراثیم یعنی بیکٹیریا بھی اس کے ساتھ مل جاتے ہیں اور بخار میں تیزی آسکتی ہے۔

تیسرے مرحلے پر یہ اس جگہ تک رسائی حاصل کرتا ہے جہاں سانس کی باریک ترین نالیاں اور Air sacs میں (اللہ کی صناعی کے نادر نمونے) سے آکسیجن باریک پردوں سے گزرتے ہوئے خون کی نالیوں میں شامل ہوتی ہے۔ (بلاشبہ ہمارا سانس لینا، بغیر کسی مشقت کے، بہت بڑا معجزہ ہے ۔ بہت بڑی نشانی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی لطیف صناعی اور مہربانی ہے، جس کا ہم شکر ادا نہیں کر سکتے۔

اس مرحلے پر انسان کے خلیات ، وائرس کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں ان سے ایسا مواد نکلتا ہے جو airsacs میں پھیل جاتا ہے۔ پہلے X ray میں سفید دھبے نظر آتے ہیں اور یکا یک پھیپھڑے میں سفیدی بھرنے لگتی ہے اور آکسیجن خون میں شامل نہیں ہو پاتی اس مرحلے سے پہلے ہی، علامات کی مدد سے آکسیجن انجذاب سے تشخص اور بروقت علاج کے ذریعے اور یقیناً اللہ کی مدد سے بیماری کی شدت کو روکا جا سکتا ہے ۔(یہ تیسرا مرحلہ اچانک اتنی تیزی سے شروع ہوسکتا ہے کہ علاج کرنے والوں کو بھی حیران کر دیتا ہے اور مریض تشویشناک حالت میں جا پہنچتا ہے)۔

اس مرحلے میں خون کی نالیوں میں توڑ پھوڑ ہوتی اور چھوٹے چھوٹے clot بننے لگتے ہیں۔ اس عجیب بیماری میں چونکہ مریض کی سانس میں دشواری کی کیفیت، مرض کی شدت کی نسبت کم ہوتی ہے اس لیے اگر ایسی علامات شروع ہوں تو ایک آلے کی مدد سے جسم میں آکسیجن کی مقدار کا تناسب دیکھا جاتا ہے جسے pulse oximeter کہتے ہیں۔ (اسے انگلی پر لگایا جاتا ہے 98 فیصد سے زیادہ آکسیجن تسلی بخش ہے 94 فیصد یا اس کم پر آکسیجن سلنڈر کی ضرورت پڑسکتی ہے اور 92 فیصد سے کم پر بہتر ہے کہ مریض ہسپتال میں عموماً آکسیجن کے استعمال سے بہتری آجاتی ہے۔) سینے کا ایکسرے بھی ابتدائی تشخیص میں ناکافی ہو تو ، سی ٹی سکین سے اصل صورتحال کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ آخری مرحلے پر پہنچ کر دوبارہ صحت کی حالت میں آنا ایک دشوار عمل ہے جو اللہ کے لیے تو زیادہ مشکل نہیں مگر عالم اسباب میں (جو قوانین اللہ نے اس دنیا کے لیے مقرر کیے ہیں) ایسا ہونے کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ بہت ضروری ہے کہ بیماری کو ہونے سے روکا جائے۔ ہمارا دین ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ ہم اپنی صحت کی حفاظت کریں، حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل کریں (اللہ کو طاقتور مومن پسند ہیں) اور اس کے لیے قوت مدافعت بڑھائے ، اللہ پر یقین کے ساتھ دعا کرنے اور بیماری کے پھیلاؤ کو روکنے کی تمام کوششیں شامل ہیں۔

شروع میں ہم نے بہت سا وقت افواہوں اور شکوک وشبہات کی نظر کر دیا پھر عید کے موقع پر لاک ڈاؤن کی نرمی سے غلط فائدہ اٹھایا، حالانکہ اس سے پہلے بہت سی چیزوں کے بغیر، بازار جائے بغیر، زندگی گھر والوں کے ساتھ اچھی گزر رہی تھی الحمدللہ۔ گھروں میں رہنے کے سکون کو محسوس کیا جا رہا تھا، رمضان کی عبادت اور قرآن پڑھنے اور سمجھنے میں بھی لطف زیادہ تھا۔ کچھ دنوں کی بدنظمی، بے صبری کے نتیجے میں کورونا کیسز اور اموات میں انتہائی تیزی آگئی۔ اگر اب بھی ہم سنبھل جائیں اور احتیاط کریں تو وبا پر قابو پایا جا سکتا ہے اللہ کے فضل اور رحمت سے (اب تو ہسپتال بھر چکے میں اور ڈاکٹرز تیزی سے مرض کی لپیٹ میں آرہے ہیں) اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا کہ جس نے ایک جان کو بچایا اس نے پوری انسانیت کو بچایا اور یہاں تو کئی قیمتی انسانی جانوں کا معاملہ ہے۔

موجودہ کورونا وائرس کے لیے کون سے ٹیسٹ ضروری ہیں

کووڈ 19 کی تشخیص کے لیے Antigen pcr test کرایا جاتا ہے۔ جس کے لیے ناک کے آخری حصے کے پیچھے گلے سے نمونہ لیا جاتا ہے۔ نمونہ لینے والے کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ پھر بھی اس ٹیسٹ سے

60-75 فیصد بیماری کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ باقی لوگوں میں بیماری ہوتے ہوئے بھی ٹیسٹ منفی آ سکتا ہے جس کی کئی وجوہات ہیں۔ سو اس صورت میں بھی قطعی طور پر وائرس کی غیر موجودگی کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ٹیسٹ علامات ظاہر ہونے سے 2 دن پہلے (یعنی incubation period) میں جب کہ وائرس جسم میں پہنچ جاتا ہے مگر ابھی علامات ظاہر نہیں ہوتیں) اور 7 دن بعد تک کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات کئی ہفتے تک یہ ٹیسٹ مثبت رہتا ہے جبکہ بیماری کی علامات ختم ہو چکی ہوتی ہیں۔ اب یہ انفیکشن نہیں، بلکہ وائرس کے بچے کھچے ٹکڑوں کی وجہ سے ہے ٹیسٹ مثبت آنے کی صورت میں مریض کو باقی لوگوں سے علیحدہ رہنا چاہیے تا کہ انہیں یہ بیماری نہ لگے، اگر سہولت ہو تو یہ وقت گھر پر بھی با آسانی گزارا جا سکتا ہے، الا یہ کہ ہسپتال جانا ضروری ہو۔ اگر ٹیسٹ منفی ہو اور علامات کورونا کی ہوں تو دو تین دن تک دوبارہ ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر علامات ظاہر ہوئے 10 دن ہو چکے ہوں تو PCR کے ساتھ Anti body ٹیسٹ بھی کیا جاتا ہے یہ ٹیسٹ 80 فیصد تک لوگوں میں بتاتا ہے کہ انہیں انفیکشن ہو چکی ہے۔ لیکن یہ اس بات کی یقین دہانی نہیں ہے کہ دوبارہ انفیکشن نہیں ہوگی اس لیے احتیاط اب بھی ضروری ہے۔

چنانچہ مرض کی علامات اگر کورونا کی طرف جا رہی ہوں تو دوسروں سے علیحدہ ہونا ضروری ہے خواہ ٹیسٹ منفی ہو۔

مرض کی شدت دیکھنے کے لیے ڈاکٹر ct chest,chest x ray D.Diners calcitonin serum ferritin کرا سکتے ہیں آیئے دیکھتے ہیں کہ کورونا وبا کی اس آزمائش میں ہمارے کرنے کے کام کیا ہیں۔

رجوع الی اللہ

اللہ کی پہچان، اللہ سے بہترین تعلق قائم کرنے کی کوشش، فرائض کی بہ احسن ادائیگی نوافل، صدقات، دعا جو عبادت کا مغز ہے۔ قرآنی اور مسنون دعائیں، اذکار، عافیت، حفاظت کی دعائیں، اللہ پر توکل کے ساتھ۔ اس یقین کے ساتھ کہ زندگی اور موت، صحت اور بیماری مکمل طور پر اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو بظاہر بیماری کی آخری اسٹیج پر ہوتے ہیں اور صحت یاب ہو جاتے ہیں اور کتنے لوگ اچانک چلے بھی جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کرنے والے، عافیت دینے والے، پناہ دینے والے، نگہبان ہیں۔ اس وبا کے دوران دنیا میں مسلمان ڈاکٹرز کی خدمات کو بھی سراہا گیا۔ ایسی ہی ایک خاتون پاکستانی نژاد ڈاکٹر جو امریکہ کی ایک ریاست میں کووڈ کے آئی سی یو کی انچارج ہیں، اُن سے جب وہاں کے گورنر نے انٹرویو کیا اور ان کا شکریہ ادا کیا تو ان سے پوچھا کہ آئی سی یو کے مریضوں کی نگہداشت کرتے ہوئے آپ کا یہ رمضان تو بہت مشکل گزرا ہوگا تو انہوں نے کہا کہ یہ رمضان تو میرے لیے روحانی بالیدگی کا باعث بنا۔ جب میں اردگرد مریضوں کو دیکھتی تھی تو دل شکر کے جذبے سے لبریز ہو جاتا تھا کہ ہم اتنی آسانی سے اللہ کی مہربانی سے سانس لے رہے ہیں۔ یہ رمضان تو اللہ سے، قرآن سے زیادہ تعلق کا باعث بنا (الحمدللہ)۔

تدبیر

اسلام دین فطرت ہے۔ اس میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے یہ توکل اور تدبیر کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ہمارا دین ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم اُونٹ باندھ کر توکل کریں۔

پیارے نبیؐ اور صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ بعد میں آنے والے اہل علم کی زندگیاں بھی اس کے مطابق تھیں۔ انہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر، قرآن و سنت کی پیروی کرتے ہوئے دنیا میں بہترین طریقے سے اپنا کردار ادا کیا۔ مسلمانوں نے اس دور میں دنیا کی سب سے بڑی ریاست کی بنیاد رکھی اور اسے بہترین اصولوں (عدل و انصاف، سچائی و دیانت) پر چلایا۔ (آج ہمارے زوال کے اسباب میں ہماری سستی، بے تدبیری، غیر ذمہ دارانہ رویے شامل ہیں۔) جو مقصد زندگی سے غفلت کا نتیجہ ہیں۔

حضرت ابو یعلی شداد بن اوسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام خوش اسلوبی سے کرنے کا حکم دیا ہے''۔

مومن تو اللہ کی رضا کی خاطر اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچانے کے

لیے دنیاداروں سے زیادہ تندہی سے کام کرتا ہے۔

حضرت ابوسعید سعد بن مالک بن نسان خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا۔

''اسلام میں کسی کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں ہے''۔

چنانچہ دعا کے ساتھ احتیاطی تدابیر اختیار کرنا، اپنے آپ کو اور دوسروں کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرنا، اپنی اور دوسروں کی صحت کی حفاظت کرنا بھی ہمارا دینی فریضہ ہے اور اللہ کی رضا کی نیت سے کرنے والے یہ کام بھی انشاءاللہ ہمارے لیے بہت اجر کا باعث بن سکتے ہیں۔

احتیاطی تدابیر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بے شمار قوتیں اور صلاحیتیں (اختیاری یا غیر اختیاری) عطا کی ہیں ان میں انسانی جسم کی قوت مدافعت، بیماری کے جراثیم کے خلاف انسان کی حفاظت کرتی ہے۔ صحت مند فرد ہوں یا بیمار، دونوں کے لیے بیماری سے بچاؤ یا بیماری کی شدت کو کم رکھنے کے لیے یہ قوت مدافعت بہت اہمیت کی حامل ہے۔

اس قدرتی قوت مدافعت کو مضبوطی دینے میں چند چیزیں بہت اہم ہیں۔

(۱) مناسب خوراک (۲) مناسب ورزش / سیر (۳) مثبت انداز فکر / پریشانی سے بچنا (۴) مناسب نیند۔

1۔ قرآن حکیم میں جس جس غذا کا ذکر ہے مثلاً زیتون، شہد، کھجور، انجیر اور طب نبویؐ میں جن غذاؤں کا ذکر ہے۔ یہ سب مناسب مقدار میں صحت اور قوت مدافعت کے لیے فائدہ مند ہیں۔

خوراک میں وٹامن اے، بی، سی، ڈی، فولک ایسڈ و زنک (zinc) قوت مدافعت کے لیے ضروری ہیں۔ جبکہ شوگر کا استعمال قوت مدافعت کو کم کرتا ہے اور یہ اثر جسم میں پانچ گھنٹے برقرار رہتا ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ، پھل، مختلف سبزیاں سب ہماری غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مناسب مقدار میں ضروری ہیں۔

ریشہ دار غذا (fiber) اور prebiotics مثلاً کیلا، فلیکس سیڈ (السی کے بیج) بھی قوت مدافعت کو مضبوط کرتے ہیں۔ (تمام چیزیں مناسب مقدار میں ہوں)۔

zinc بغیر چھنے آٹے، دودھ، دہی، گوشت، بینز (beans)، خشک میوہ جات (بادام، اخروٹ) حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح vit-c سبزیوں، سرخ اور سبز مرچ، گوبھی، پالک، شلجم، آلو، ٹماٹر اور مختلف پھلوں، لیموں، مالٹا، امرود، پپیتہ، سٹرابری میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے vit-c کی کمی بھی قوت مدافعت کو کم کرتی ہے۔ دھوپ میں بیٹھنا ممکن نہ ہو تو اس کے supplement ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

شہد، کلونجی میں بھی شفا ہے، دار چینی، ادرک، پودینہ کے ساتھ سبز قہوہ بھی صحت مند افراد اور بیمار افراد سب کے لیے مفید ہے۔

2۔ ہلکی پھلکی ورزش اور سیر خصوصاً صبح کے وقت، جسمانی، ذہنی، روحانی صحت کے لیے ضروری ہے اور قوت مدافعت کو بڑھاتی ہے۔

3۔ قلبی اطمینان اور سکون خوش رہنا اور خوش رکھنا، محبت کا اظہار، دل صاف رکھنا، مسکرانا (صدقہ ہے) خوشدلی سے ملنا، معاف کرنا، حوصلہ افزائی کرنا، یہ سب رویے مسنون ہیں اور جسمانی، روحانی، ذہنی، سماجی صحت کے لیے ضروری ہیں۔ (اور دلوں کو سکون اور اطمینان تو اللہ کی یاد سے ہی ملتا ہے)۔ ویسے بھی مسلمان نہ تو مایوس ہوتا ہے، نہ اس کے لیے خوف اور غم ہے۔ بس اللہ کی ناراضگی سے ڈرتا ہے۔

4۔ مناسب نیند اور آرام بھی ضروری ہے

5۔ دن میں دو بار بھاپ لینا بھی مفید ہے۔ گلا تر اور صاف رکھیں۔

6۔ ممکن ہو تو دیسی مرغی کی یخنی لیں۔

صحت کا صفائی سے گہرا تعلق ہے

- ہاتھوں کو بار بار صابن سے بیس سیکنڈ تک دھونے سے جراثیم سے پاک کیا جا سکتا ہے، اس طرح کہ ہاتھوں کی تمام سطحیں اچھی طرح صاف ہو جائیں۔
- کھانے سے پہلے، کھانے کے بعد، ضروریات سے فراغت پر

ہاتھ دھونا مسنون ہے، باہر سے گھر داخل ہوکر، نوٹوں کو چھونے کے بعد بیرونی دروازے کے ہینڈل چھونے کے بعد خصوصاً ہاتھ دھونا چاہیے۔

• وضو میں ناک اور گلے کو اچھی طرح صاف کیا جائے۔ دانتوں کی صفائی کا خیال رکھا جائے ہر بار کھانے کے بعد کلی کرنا، دانت صاف کرنا، کپڑوں کی صفائی ہفتہ وار ناخن تراشنا، غسل کا اہتمام کرنا، جسم کو جراثیموں سے پاک کرتا ہے۔

• نیم گرم پانی اور نمک سے غرارے، حلق کی صفائی کے لیے مفید ہیں۔

• ٹھنڈے پانی سے پرہیز بھی ضروری ہے۔

ماحول کی صفائی

• بیماری سے بچنے کے لیے ماحول کی صفائی بھی ضروری ہے۔

• گھر سے بغیر شدید ضرورت کے نہ نکلیں۔

• گھروں کو جراثیم کش محلول سے فرش اور ہینڈل وغیرہ صاف کریں۔

• دن میں کچھ دیر کھڑکیاں کھولیں تاکہ ہوا کا دوران صحیح رہے

• گھر کے سامان کو بھی صاف ستھرا رکھیں۔

• گھر میں باہر سے آتے ہوئے ہاتھ دھونا senitize کرنا۔

سماجی فاصلہ

• اس کا مقصد بھی ماحول کو جراثیم سے پاک رکھنا ہے۔

• چنانچہ گلے اور ناک کی رطوبت 6 فٹ تک فاصلے طے کرسکتی ہے اس لیے گھر سے باہر ماسک کا استعمال، گھر میں احتیاط، چھینکتے ہوئے یا کھانستے ہوئے منہ کے سامنے ہاتھ یا کہنی کا رکھنا، ضروری میل جول میں بھی فاصلہ رکھنا اور ماسک کا استعمال کرنا ضروری ہے۔

انفرادی حفاظتی سامان ppe عام استعمال کے لیے ماسک اور گلووز باہر جاتے ہوئے اگر گھر میں کووڈ 19 کے مریض ہوں تو ان کی نگہداشت کے وقت حفاظتی لباس اور N-95 ماسک کا استعمال جو پوری طرح منہ کو ڈھانپ لیتا ہے اور سانس کے لیے براہ راست سامنے کی ہوا استعمال نہیں ہوتی۔ ماسک جو ایک دفعہ استعمال کے لیے ہوں، انہیں بار بار استعمال نہ کریں۔ ٹشو استعمال کے بعد پھینک دیں۔ N-95 بھی 40 گھنٹے سے زیادہ استعمال نہ کریں باہر سے آتے ہوئے جوتے اور لباس تبدیل کرلیں۔

• گھر میں زیادہ آمدورفت نہ رکھیں۔

• بیمار شخص کی دوسروں سے علیحدگی isolation (اگر pcr مثبت ہو) شروع میں ایسے تمام لوگ جن کا pcr ٹیسٹ مثبت تھا انہیں گھروں سے لے جا کر ہسپتال میں یا اس سے ملحق عمارتوں میں رکھا گیا۔ اس سے لوگوں کو مشکلات بھی ہوئیں اور پریشانی بھی۔ اب جبکہ ہسپتالوں میں جگہ بھی نہیں ہے تو گھروں میں آئسولیشن کی جارہی ہے جب تک کہ مریض کے لیے ہسپتال جانا ضروری ہو۔ ڈاکٹرز کی ہدایات کے مطابق گھروں میں علاج بھی کیا جارہا ہے اور ایک حد تک آکسیجن بھی فراہم کی جارہی ہے۔ اس کے باوجود اگر مرض کی شدت میں کمی نہ ہو، آکسیجن کی مقدار کم رہے تو ہسپتال جانا ناگزیر ہے۔

• گھر میں آئسولیشن مریض کے لیے زیادہ ذہنی سکون، آرام اور غذا کی فراہمی کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اس کے لیے کچھ عمومی ہدایات ہیں اگر یہ سہولت نہ ہوں مریض چاہے تو وہ ہسپتال جاسکتا ہے۔

• مریض کا کمرہ علیحدہ ہو اور ملحقہ غسلخانہ ہو۔

• مریض کے کمرے کے باہر کوئی میز رکھ دی جائے جس پر کھانا رکھا ہو جسے وہ لے لے۔ disposable پلیٹس بھی استعمال کی جاسکتی ہیں اور استعمال شدہ برتنوں کو اچھی طرح دھویا بھی جاسکتا ہے۔

• مریض کا ٹمپریچر دن میں دو دفعہ دیکھا جائے۔ ضرورتاً پینا ڈول دی جاسکتی ہے۔

• pulse oximeter موجود ہو تاکہ آکسیجن کی مقدار دیکھی جاسکے۔

• مناسب خوراک، پانی زیادہ اور مناسب ورزش جاری رکھیں۔

• مریض بھی رابطہ کی صورت میں N-95 ماسک استعمال کرے، مریض کو تسلی دیں۔ لاباس طھور ان شا اللہ۔

• کورونا کی تشخیص کے ساتھ ماں اپنے بچے کو دودھ پلاسکتی ہے بشرطیکہ تمام احتیاطی تدابیر ملحوظ رکھے۔

• یہ فرصت کے لمحات غنیمت ہیں، جن میں اپنے اللہ سے تعلق بڑھانے، اپنے آپ سے باتیں کرنے، پہچاننے، غور وفکر کرنے، محاسبہ کرنے، مطالعہ قرآن، حدیث، سیرت، دعا، اذکار، نوافل کا بہترین موقع ہے۔ (اعتکاف کی طرح)۔ سورہ رحمٰن یا قرآن کی دوسری صورتوں کی تلاوت، ترجمہ، تفسیر سنی جاسکتی ہے۔

• مناسب آرام کا بھی وقت مل سکتا ہے۔

• اپنی کسی عادت پر غور کرنے اور اچھی عادات اپنانے کی بھی پلاننگ ہوسکتی ہے۔

• نماز کی بروقت اور بہتر ادائیگی کی کوشش ہوسکتی ہے۔

14 دن بعد انفیکشن کے اثرات ختم ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ آئسولیشن ختم کی جاسکتی ہے مگر ضروری ہے کہ بقیہ تمام احتیاطیں لازماً جاری رکھیں۔ البتہ طبی عملے کے لیے ضروری ہے کہ ہسپتال جانے سے پہلے ان کے 2 کورونا ٹیسٹ منفی ہوں۔ دیکھا گیا ہے کہ اگر مریض ماسک استعمال کرے تو بیماری پھیلنے کا تناسب بہت کم ہوجاتا ہے اور دوسرے افراد نے بھی ماسک پہنا ہو تو اور بھی کم ہوجاتا ہے۔

(اس لیے یہ ضروری ہے کہ کسی بھی اور وجہ سے اگر ڈاکٹر کے پاس معائنے کے لیے جانا ہو تو ماسک پہن کر جائیں کیونکہ 80 فیصد لوگوں میں علامات نہیں ہوتیں۔ اس طرح ہم طبی عملے کو بیماری سے بچا سکتے ہیں۔ جو اپنی اور اپنے گھر والوں کے Risk پر بھی خدمت کے جذبے سے کام کر رہے ہیں)۔ وبا چونکہ عام ہے اس لیے اصولاً یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ بیماری کسی کو بھی ہوسکتی ہے اس لیے ہمیں احتیاط کرنی ہے، خود بھی بچنا ہے اور دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد سے۔

بیماری کو پھیلنے کے لیے جراثیم کی ایک خاص مقدار viral load کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً کووڈ 19 کے لیے 1000 وائرل پارٹیکلز، سانس لینے میں 20 ایسے ذرات ایک منٹ میں خارج ہوتے ہیں بولنے میں 200 اور کھانسنے اور چھینکنے میں 200 ملین۔ اگر جگہ تنگ ہے، ہوا کی آمد و رفت نہیں تو یہ ذرات گھنٹوں معلق رہ سکتے ہیں۔ بند جگہوں مثلاً اداروں، ریسٹورنٹس میں یہ رسک بڑھ جاتا ہے۔ ماسک پہننے سے رسک کم ہوگا مگر بند جگہوں پر زیادہ لوگوں میں رہے گا۔ مشہور حدیث میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ جہاں وبا پھیلی ہو وہاں سے باہر نہ جاؤ اور باہر سے اس جگہ نہ جاؤ جہاں وبا پھیلی ہو۔ اس پر عمل کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کے ایک سپہ سالار صحابیؓ نے وبا کے علاقے سے آنے کے حکم پر عمل نہ کیا کہ حضورؐ کا یہ فرمان سامنے تھا۔

آج سے 14 سو سال سے زیادہ عرصہ پہلے پیارے نبیؐ نے ہمیں چھینکنے، کھانسنے کے جو اسلامی آداب سکھائے جبکہ دنیا میں بیماری اور اس کے پھیلاؤ کے بارے میں معلومات بہت کم تھیں جہاں تک ادویات کا تعلق ہے، وہ ڈاکٹرز کی ہدایت کے بغیر استعمال نہ کریں کہ اب تحقیق جاری ہے اور نئے حقائق سامنے آرہے ہیں۔ دواؤں کے side effet اور اچھے اثرات کا موازنہ بھی ڈاکٹر ہی کرسکتے ہیں۔

خدمت

کورونا کی اس وبا میں لوگ مختلف قسم کے مسائل کا شکار ہوئے، جس میں ذہنی پریشانی، صحت کی پریشانی، مالی پریشانی، اپنوں سے دوری شامل ہیں۔ ایسے میں بہت سے لوگ خدمت کے جذبے سے اٹھے اور ایک دوسرے کو پرسکون رہنے کی تلقین کی۔ رشتہ داروں، ہمسایوں، ضرورت مند لوگوں کی تلاش کر کے خاموشی سے ان کی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ اس طرح کچھ لوگوں کے ذریعے کچھ لوگوں کو آزماتے ہیں اور خلوص سے کی گئی ان کوششوں کے بہترین قدردان ہیں، اپنی ضرورتوں کو محدود کر کے سادگی اپنا کر، اس کام کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس وبا کے بعد بھی جب تک ہمارا معاشرہ واقعی ایک اسلامی معاشرہ نہ بن جائے جہاں ہر ایک کی بنیادی ضرورت پوری ہو۔ کوئی بھوکا نہ ہو، کسی کو دوائی کے حصول میں مشکل نہ ہو، کسی کو تعلیم کے اخراجات کی پریشانی نہ ہو۔

اس دوران جن لوگوں نے سادگی سے طے شدہ تاریخوں پر بیٹیوں کو رخصت کیا، اس سے معاشرے میں ایک نئی روایت ڈالی جاسکتی ہے اور لاکھوں روپیہ، خدمت کے ان کاموں پر خرچ ہوسکتا ہے۔

لاک ڈاؤن میں لوگوں نے اپنے ان مظلوم بہن بھائیوں کے دکھ کو بھی کچھ محسوس کیا جو اس سے کئی گنا زیادہ خوف اور خطرے کی فضا میں گھروں میں بند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائیں اور ہمیں ان کے لیے سچا خلوص اور درد عطا فرمائیں۔

احتساب

آخری بات یہ کہ کرونا کی یہ حالیہ وبا جس نے ساری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے ہمیں انفرادی اور اجتماعی احتساب کی دعوت دے رہی ہے۔ وہ کون سی باتیں ہیں جن پر قوموں پر اللہ کی پکڑ آتی ہے۔ کہیں اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض تو نہیں؟ ہماری انفرادی اور اجتماعی بحیثیت پاکستانی، بحیثیت امت کون سی غلطیاں ایسی ہوسکتی ہیں، جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوں؟ ہمیں سچی توبہ کرنی ہے جس کے لیے غلطیوں کے ادراک، احساس ندامت، تلافی کی بھرپور کوشش کی ضرورت ہے، پھر اللہ تو غفور الرحیم ہے (ہم نے تو ہر اس چیز کی قیمت بڑھادی جس کی مانگ بڑھی۔ نہ ہمارے میڈیا نے رویہ بدلا) ہماری عمومی زندگی مشین کی طرح دوڑ رہی تھی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں رک کر سوچنے کا، غور کرنے کا موقع دیا ہے۔ یہ دنیا تو فانی ہے، یہاں آنے کی ترتیب ہے، جانے کی نہیں، تو اپنی آخرت کے لیے سرمایہ اکٹھا کرو۔ ہجوم نہیں، قوم بنو، اپنے مقام کو پہچانو، تم کیا تھے؟ کیا ہو اللہ تمہیں کیا مقام دینا چاہتے ہیں۔ اپنے آپ کو اپنے خالق کو پہچانو، حق ادا کرنے کی کوشش کرو پیدا کرنے والے کا اور اس کے بندوں کا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس وبا سے نجات دلائیں پوری انسانیت کو۔ ہمیں سچے مومن بن کر اپنے فرائض پہچاننے کی توفیق دیں ہماری زندگی مثبت رُخ پر رواں ہو اور سب سے راضی ہوں آمین۔

چنانچہ احتیاط کریں، دعا کریں، مطمئن رہیں، خوشیاں بانٹیں، اللہ سے جڑ جائیں اور لوگوں کو جوڑیں۔ خاص طور پر طبی عملے کے ہراول دستے کے لیے بھی دعا کریں جو اس جنگ میں صف اول میں کھڑے ہیں اور اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ہمیں بچا رہے ہیں۔ ان کی خاطر اپنی اور اپنے گھر والوں کی خاطر، احتیاط کریں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں اور اس طرح اپنا حصہ بھی ڈالیں تاکہ ہم ایک باشعور، صحت مند مسلمان قوم کی مثال بن سکیں۔

پیامہیلپ لائن کے نمبر

صبح 9 سے دوپہر ایک بجے تک 03155550911

دوپہر 1 سے شام 5 بجے 03166660912

شام 5 سے رات 9 بجے تک 03177770913

☆.....☆.....☆

اگر اس وقت میں ہوتی!

اگر اس وقت میں ہوتی
محبت کی فصیلوں پر
میں عمارہ نظر آتی
کسی بھی ڈھال کی صورت
گرجتی اور چمکتی برق کی مانند
صفیہ بن کے ڈٹ جاتی
اگر اس وقت میں ہوتی
شہادت کی امنگوں سے بھرے جذبوں سے
پنجوں بل کھڑی ہو کر
معوذ و معاذ میں ہوتی
اگر اس وقت میں ہوتی
کہ جب راہِ شہادت میں سب اپنا مال دیتے
جوش سے سرشار دِکھتے تھے
فقط چند اک کھجوروں سے
جو سبقت لے گئے سب پر
میں وہ ایمان پا لیتی
اگر اس وقت میں ہوتی
کہ جب تشریف لاتے تھے
رسولؐ رحمتِ عالم مدینے کی فضاؤں میں
عجب مہکی ہواؤں میں
جب استقبال کرنے کو
ہر اک بے چین ہوتا تھا
بس ایک دیدار کرنے کو
کسی چھت پر وہاں ہوتی
نگاہیں ٹکٹکی باندھے
رسولِ پاک کو میں بھی
تب آنکھوں میں بسا لیتی
حیاتِ جاوداں پاتی!

ہاجرہ منصور

فرحت نعیمہ

کل عید ہے

''ام۔می۔می۔ای۔ای.....''

سمن آرا کی آواز باورچی خانے سے ہوتی ہوئی برآمدے میں تخت پر لیٹی امی جان تک پہنچی۔

''کیا بات ہے؟ کیوں اس قدر غل مچا رکھا ہے؟'' وہ ابھی تھک کر کمر سیدھی کر رہی تھیں اس لیے ذرا بیزاری سے پوچھا۔

''وہ دراصل میں کوفتوں کے لیے سِل پر قیمہ پیسنا چاہ رہی تھی مگر بٹہ نہیں مل رہا کہاں رکھ دیا؟'' سمن آرا اب باورچی خانے سے جھانک کر امی جان سے پوچھ رہی تھی۔

''ارے بھئی سل کے پاس ہی رکھا ہوگا۔ اور کہاں جانا ہے۔ ذرا غور سے دیکھو نا!''

''پتہ نہیں سارا باورچی خانہ چھان مارا ہے مل ہی کر نہیں دے رہا''۔ اب سمن آرا بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانہ میں اٹھا، پٹخ کر رہی تھی۔ ''یہ رہا.....نعمت خانے میں کس نے رکھ دیا تھا''۔ یہ کہہ کر سمن آرا زور وشور سے سل پر قیمہ پیسنا شروع ہوگئی۔

دالان میں ابا کیاریوں کی جھاڑ جھنکاڑ کو سلیقے سے تراشنے میں مصروف تھے۔ امی نے آرام ترک کر کے زیب النسا کے غرارے کی گوٹ اپنے آس پاس بکھری ریشمی کپڑے کی کترنوں میں ڈھونڈنا شروع کر دی۔ ساتھ ہی سمن آرا کو آواز دی۔

''بیٹی سفید مصالحہ تیار کرنے لگو تو تمام چیزوں کی مقدار اپنی دادی جان کو دکھا لینا۔ تمہارے ہاتھ کا اندازہ ٹھیک نہیں ہے''۔

''اچھا امی.....'' سمن آرا نے سل بٹے کو چھوڑ کر تھوڑی دیر آرام کا سانس لیا۔

''لو، اب یہ حکم جاری ہوگیا''۔

اتنے میں (بڑے کمرے) سے دادی جان برامد ہوئیں ہاتھ میں سلفچی تھی جو انھوں نے تخت کے پاس نیچے فرش پر رکھ دی۔ ابا نے آفتابے میں پانی بھر کر ان کے ہاتھ دھلائے۔ امی جان نے تخت پر ان کے لیے جگہ بنائی تو وہ کہنے لگیں۔

''اے نفیسہ دلہن! وہ بادام پستے کی ہوائیاں کاٹ لیں کہ نہیں؟''

''اماں رات ہونے سے پہلے پہلے زیب النساء کا غرارہ سل جائے۔ وہ میں بعد میں کرلوں گی''۔

دادی اماں نے کہا ''لاؤ ادھر میں کتر دیتی ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔ ہاتھ کے ہاتھ جو کام ہو جائے بہتر ہے''۔

''جی اماں!'' نفیسہ دلہن نے سعادت مندی سے بادام پستے کی کٹوریاں چاقو سمیت ان کے حوالے کیں۔

''چھوہارے اور کشمش صبح کے لیے بھگو دی ہے نا!''

''جی اماں وہ تو میں نے دوپہر میں ہی کر لیا تھا۔ آپ بتائیے اس مرتبہ زعفرانی سویاں بناؤں یا شیر خرما.....کوفتوں کا مصالحہ تو سمن آرا کر لے گی''۔

''میرا خیال ہے نفیسہ دلہن کہ شیر خورما ہی تیار کر لینا۔ انیسہ کو بھی بہت پسند ہے۔ (انھوں نے اپنی بیٹی کا نام لیا) اور محسن میاں بھی اسی کا پوچھتے ہیں۔ ہاں اماں اور بڑے بھیا بھی پچھلی دفعہ ہی کہہ رہے تھے کہ نفیسہ کے ہاتھ کا شیر خورما خاندان میں سبھی گھروں سے بہتر بنتا ہے''۔

ابا جو کیاریوں کو درست کرنے کے بعد اب آفتابے سے پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے مسکرا کر بولے۔

''ہاں بس ان کو تو اپنی تعریف کا موقع چاہیے ہوتا ہے جو سال میں دو دفعہ تو آ ہی جاتا ہے''۔

اے لو جی! آپ تو بس.....'' امی جان کچھ کھسیا سی گئیں۔ دادی جان نے

نظروں ہی میں اپنے بیٹے کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

''نہ بھئی اس معاملے میں تو میں بھی اپنی بہو کے گن گاؤں گی۔ کھانا ہو تو ایسا کہ لوگ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ یاد ہے پارسال کیا مزے کا 'مغلئی پلاؤ' بنایا تھا۔ ابھی تک آس پڑوس سے اس کی خوشبو نہیں گئی''۔

''گھی سنوارے سالنا بڑی بہو کا نام! اماں آپ بھی تو مبالغے کی حد کر دیتی ہیں'' ابا کچھ جھنجھلا کر بولے۔

اتنے میں کسی نے زور زور سے دروازے کی کنڈی بجائی۔ ابا ڈیوڑھی سے گزر کر دروازہ کھولنے چلے گئے۔ امی جان نے سمن آرا کو آواز لگائی۔ ''اب مصالحہ لا بھی چکو۔ دیکھو اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو جلدی معلوم ہو جائے گا۔ کاکا جان آتے ہی ہوں گے ان سے دہی اور دوسری چیزیں منگاؤں پھر صبح سویرے دوڑانا اچھا نہیں لگے گا''۔ سمن آرا باورچی خانے سے نکلی تو اس کے ہاتھ میں دو طشتریاں تھیں جن میں سے ایک میں تھوڑی سی خشخاش اور بھنے چنوں کی کھیلیں اور دوسری میں باریک کٹا ناریل اور بادام تھے۔

دادی جان نے بادام کی ہوائیوں میں سے مٹھی بھر مزید اس میں شامل کر دیا۔

''لو جاؤ اس سارے کو خوب اچھی طرح کچل مسل کر پیسنا۔ بالکل باریک ہو جائے ورنہ کوفتوں میں کچر کچر کرے گا۔ اور ذری تیز ہاتھ چلاؤ نا ابھی بہتیرے کام رہتے ہیں''۔

''اچھا اماں'' سمن آرا نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

''نفیسہ دلہن لاؤ تو چاول ابھی سے چن کر رکھ دوں''۔ دادی اماں اب امی جان کی طرف متوجہ تھیں۔

''نہیں اماں وہ تو میں نے کب کے چن کر رکھ دیے''۔

''بوا جی کہاں رہ گئی ہیں؟ انھیں صفائی ستھرائی کا خبط ہے۔ لگی ہوں گی مردان خانے کی صفائی میں..... کہہ رہی تھیں میاں جی کے دوست آئیں گے کل۔ کہیں جھاڑ پونچھ نہ رہ جائے۔ ورنہ میں نے تو صبح صبح ہی تکیوں اور تخت پوشوں کے غلاف بدلوا دیے تھے''۔

امی جان اب تیزی سے زیب النسا کا غرارہ مکمل کرنے میں لگی تھیں جو اس نے صبح پہننا تھا۔ ابا نا معلوم کسی کے ساتھ شاید ڈیوڑھی سے ہی کہیں چلے گئے تھے۔ اتنے میں کاکا جان پان منہ میں دبائے اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے چلے آئے۔ ''کاکا کدھر چلے گئے تھے سویرے سے شام ہوگئی ابھی سو کام جان کو آئے ہیں''۔ دادی جان نے سر کو ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اماں بڑی دلہن نے ہی بھیجا تھا گوشت لینے کو..... دیکھیے تو کس قدر تازہ ہے اس میں سے روشنی پھوٹ رہی ہے''۔ کاکا جان نے تھیلے میں سے گوشت کی پوٹلی نکالتے ہوئے کہا۔

''اے ہئے یہ بکرے کے گوشت میں سے روشنی کب سے پھوٹنے لگی، نفیسہ دلہن! دیکھ تو یہ کیا کہہ رہا ہے''۔

''اماں جان! اس میں تو شک نہیں کاکا جان گوشت بہت تازہ اور اچھا لاتے ہیں''۔

''پلاؤ کی خوشبو یونہی تو گھر گھر نہیں جاتی'' امی جان مسکرا کر بولیں۔

''ہاں ورنہ بندو قصائی کا بس چلے تو نرے چھیچھڑے ہی ڈالے۔ یہ تو ہم ہی ہیں جن کو وہ آنکھ بچا کر بھی ایسا نہیں کر سکتا''۔ کاکا جان نے اپنا کارنامہ بیان کر کے داد چاہی۔ مگر اس سے پہلے کہ اماں جان کچھ کہتیں صدر دروازے کی کنڈی ایک بار پھر بجی۔

''کاکا دیکھنا ذرا کون ہے؟ بوا تو آج مردان خانے کی صفائی میں ہی چپک کر رہ گئیں''۔

کاکا جان کے ساتھ ہی زیب النسا اچھلتی کودتی اپنی دو عدد سہیلیوں کے ساتھ آ موجود ہوئی۔ جہاں امی جان کے چہرے پر اس کو دیکھ کر روشنی چمکی وہاں اس کی سہیلیوں کو دیکھ کر بیزار بھی ہوئیں۔ مگر لہجے میں پیار سمو کر ہی کہا۔ ''آ گئی میری بچی..... یہ دیکھ کیسا چٹا پٹی (پٹا پٹی) کا غرارہ سیا ہے تمہارے لیے۔''

''امی جان یہ ہمارے لیے۔'' زیب النسا تو دیکھتے ہی مچل گئی۔ ''ہم ابھی پہنیں گے لائیے ہمیں دیجیے''۔

دادی اماں تو الجھ پڑیں ''ارے اتی بڑی لونٹھا کی لونٹھا ہوگئی۔ لچھن ابھی ننھی بچی والے۔ معلوم نہیں صبح کے لیے سیا ہے۔ ابھی پہن لیا تو صبح کیا پہنو

گی۔؟'' زیب النساء منہ بسورنے لگی تو امی جان نے بھی کہا۔

''ہاں بیٹی اب ذرا ہاتھ منہ دھو کر آرام کر لو پھر اس کے دوپٹے پر کرن تم ہی لگانا''۔

''ہمیں نہیں آتا کرن لگانا۔ آپ ہی لگایئے'' زیب النساء نے تھوڑا ٹھنک کر کہا۔ مگر اماں جان کا ایک دو ہتڑ ہی کافی تھا'' آج کل کے کپڑوں کو کرن نہ لگی ہو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

زیب النسا بسورنے لگی تو امی جان نے پچکار کر کہا'' اچھا چلو سمن آرا سے کہوں گی کرن ٹانک دے گی۔ تم سہیلیوں کے ساتھ مل کر مہندی تو گھول رکھو رات عشاء کی نماز کے بعد لگا کر سونا ہے۔'' مہندی کا نام سنتے ہی زیب النساء اور اس کی سہیلیاں کھل اٹھیں۔

دادی اماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا'' نفیسہ دلہن اچھی کہی۔ اب وہ اتنی بچی بھی نہیں کہ ٹانکا بھرنا نہ آئے۔ ارے اگلے گھر میں جا کر ساس نند سے لگوائے گی۔ اب کچھ سکھا ڈالو، اس ہڑبونگی کو بھی''۔

اچھا اماں دھیرج دھیرج۔'' سہج پکے سو میٹھا ہو..... آہستہ آہستہ سب سکھا لوں گی۔ ارے سیکھے گی نہیں تو اور کیا کرے گی۔ ہنڈکلیا تو کر ہی لیتی ہے بس سینے پرونے میں اس کا جی کم ہی لگتا ہے۔ مگر راہ پر لے آؤں گی۔ سمن آرا کی بات نہیں ٹالتی..... وہی سکھائے گی''۔

''ہاں اس برس سمن آرا بھی اپنے گھر کی ہو جائے گی تو بے رونقی ہو جائے گی''۔ دادی اماں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کیوں اماں جان واجد میاں اور زاہد میاں بھی تو ہیں پوری چھ جماعتیں تو پڑھ ہی چکے ہیں پھر اپنے ابا کے ساتھ دکان پر بیٹھیں گے تو کماؤ پوت بھی ہو جائیں گے''۔ امی جان نے یاد دہانی کروائی۔

''ہاں اگر اس پٹواری کے ساتھ ٹھٹھے بازی نہ کرتے رہتے تو..... کتنا کہا تھا کہ محسن کے چچا کے پاس ولایت بھیج دو۔ کچھ پڑھ لکھ آتے تو نام کماتے''۔ دادی اماں نے کہا۔

''ہائے میّا میں کیسے بھیج دیتی اپنے لاڈلوں کو سات سمندر پار گوروں کے دیس میں..... ان شاءاللہ یہاں بھی کامیاب ہی رہیں گے''۔ ''اللہ کرے آمین''۔ دادی اماں نے سر ہلا کر تائید کی۔

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ سورج نے غروب ہونے میں جلدی کی۔ افطاری کا سامان سمیٹنے سے پہلے ہی روزہ دار چھتوں کی طرف لپکے۔ چاند کی ڈھنڈیا پٹی..... وہ رہا..... وہ رہا..... ارے نہیں بھئی تمھاری نظر کا دھوکا ہے..... عید کا چاند ہے یونہی تھوڑی نظر آئے گا۔

زیب النساء بھی اچھلتی کودتی چھت پر تھی۔ دادی اماں پوتی کے لچھنوں کے گن گا رہی تھیں۔

''اے نفیسہ دلہن! یہ اچھی رہی۔ واجد میاں اور زاہد میاں تو ٹھیک ہیں یہ لڑکی ذات کو کیوں لڑکوں کا دم چھلا بنا دیا۔ اب اتنی بھی ننھی نہیں رہی''۔ امی جان نے تائید میں ''ہوں'' کہا اور زیب النساء کو واپسی کے لیے آواز لگانا چاہی۔ اسی اثنا میں چاند نظر آ گیا۔ چاند نظر آ گیا کا شور مچ گیا۔ لڑکے پٹاخے چھوڑنے لگے۔

بزرگوں نے برا منایا مگر'' عید مبارک'' ''عید مبارک'' کہہ کر ایک دوسرے کو گلے لگایا۔

مٹھائیوں کی دکانیں سج گئیں۔ گھروں کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دلوں پر دستک ہونے لگی۔ لڑکیاں بالیاں اپنی رنگین چنریاں لہرانے لگیں۔ غرض ہر چہرہ شاداب اور ہر گھر خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ روزہ داروں نے شکرانے کے نوافل پڑھے۔ سبھی ابا میاں سمیت گول گمرے میں خوش گپیاں کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے رات نے اپنے تاریک پر پھیلائے۔ زیب النساء کا کرن لگا دوپٹہ کھونٹی پر لٹک رہا تھا وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیلائے اپنی نیند سے مخمور آنکھوں کے ساتھ سمن آرا سے مہندی لگوا رہی تھی۔ پیالے میں ڈبو ڈبو کر تنکے سے مہندی لگانے میں سمن آرا کی آنکھیں اور کمر دکھنے لگی (زیب النساء کی ساری سہیلیوں کو بھی تو لگانی تھی نا!) مگر زیب النساء کی فرمائشیں ہی پوری نہ ہو رہی تھیں۔

''چلو بھی اب سو بھی جاؤ میں نے بھی تو مہندی لگانی ہے نا!'' سمن آرا نے پیار سے گھرکا۔

دادی اماں اپنے کمرے میں محوِ خواب تھیں۔ دالان میں چاندنی اتری ہوئی تھی اور خاموش فضا بھی رقص کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ زیب النساء بے حد اشتیاق سے اپنے کرن ٹنکے دوپٹے کو دیکھتے دیکھتے نیند

کی وادیوں میں اتر گئی۔ سمن آرا کے چہرے پر گلال بکھرنے لگا اور تن میں خوشی ہلکورے لینے لگی۔ ''کل عید ہے''۔ کسی نے سرگوشی کی۔ سمن آرا کے مہندی لگاتے مخروطی ہاتھ رک سے گئے۔ سارا دن کام کاج اور سل بٹے کی مشقت سے گو ہاتھ ذرا کھردرے تھے مگر مہندی تو ان ہاتھوں پر بھی خوب ہی رچ رہی تھی۔ سرگوشی ذرا کان کے قریب سے ابھری ''کل عید ہے''۔

ہشت یہ پاگل من.....اسے سمجھانا پڑا.....خاموش! عید ہے تو کیا.....سبھی کے لیے ہے نا.....نہیں تمہاری تو خاص ہے نا! کل سجاد میاں آرہے ہیں اپنے ابا کے ساتھ۔

تو کیا آتے رہیں ہماری بلا سے! دل نے چٹکی بھری۔

خوشی کا دن طے کرنے آرہے ہیں.....اس لیے تو کل عید ہے! وہ کچھ سوچ کر خود ہی شرما گئی۔ چاند سے آتی چاندنی کی کرنیں اس کی ادا پر مسکرانے لگیں۔

''کل عید ہے'' گنگنانے لگیں۔

☆.....☆.....☆

ماہنامہ بتول لاہور جولائی 2020ء

قانتہ رابعہ

محبتیں جو مل گئیں

علینہ نے واٹس ایپ گروپ کھولا۔ ویسے تو فیملی گروپ میں بھی پندرہ بیس میسج موجود تھے مگر ایسے ہی ہوتا تھا کبھی نند کی طرف سے دل جلا تو کبھی بھابھی نے طنزیہ اسلوب اختیار کیا۔ اور ان کا تو شکوہ بھی کیا، کہ آدھا خاندان انہیں بھابھی طنزیہ کہتا تھا مگر پیٹھ پیچھے!

سو علینہ نے فیملی گروپ کو بائی پاس کیا اور سہیلیوں والا گروپ کھولا۔ ساتھ ہی چہرے پر ٹیوب لائٹ کی چمک آئی۔ وہی جو ہمیشہ ریشماں کا..... میری ہمجولیاں کچھ یہاں کچھ وہاں..... سنتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے آتی تھی۔

اس گروپ کا نام ''ہمجولیاں'' تھا۔ وہی ہمجولیاں جو بچپن سے سائے کی طرح ساتھ تھیں۔ سکول کالج یونیورسٹی..... اور پھر وہ تو شادی کے بعد کوئی ملک اور کوئی بیرون ملک مرمرا گئیں مگر سوشل میڈیا زندہ باد۔ دن میں کم از کم پندرہ بیس مرتبہ تو گروپ ضرور کھلتا اور علینہ شانت ہو کے بند کرتی۔ آج بھی دس میسج کا علامتی نشان موجود تھا۔ ہنستے ہوئے اس نے نازیہ اسلم کا میسج دیکھا۔

''دیکھتی آنکھوں سنتے کانوں طارق عزیز کا سلام پہنچے'' ساتھ میں ایک آنسوؤں والی اموجی۔

اس کو تو خوامخواہ ڈرامے کرنے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ اس نے دوسرا میسج کھولا بینش ممتاز کا۔ وہ پھر کچھ مدبر سی تھی، یا کم از کم بننے کی کوشش کرتی واللہ اعلم!

''ہمزاد دا دکھ..... الوداع طارق عزیز اب آنکھیں تمہیں دیکھیں گی نہ کان سن پائیں گے'' اس کے ساتھ دھارو دھار آنسو بہنے والی پندرہ بیس اموجیز۔

علینہ کا ہاتھ کانپا، موبائل بے قابو ہو کے نیچے صوفے پر گرا۔

وہ سکتے کی کیفیت میں تھی۔ طارق عزیز بھی چلے گئے..... اوہ میرے خدایا!

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کا معصوم سا بچپن الھڑ جوانی طارق عزیز، عظمیٰ گیلانی اور معین اختر کے پروگراموں سے مزین تھی۔ خیالوں ہی خیالوں میں ساری سہیلیاں ان اداکاراؤں سے گفتگو کرتیں ان کے پروگراموں کی تعریف کرتیں۔ ان کی گفتگو کا موضوع عام طور پر ان کے ڈرامے اور پروگرام ہوتے نیلام گھر ان کا پسندیدہ پروگرام تھا ان کی ایک کلاس فیلو نے نیلام گھر میں شرکت کی تھی اور واٹر کولر جیت کے لائی تھی..... مدت مدید تک وہ اس کلاس فیلو کی دیوانی رہیں۔ کرید کرید کے طارق عزیز اور نیلام گھر کے متعلق سوال کرتی رہیں۔

نیلام گھر کے آخر میں جب دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے طارق عزیز پاکستان کہتا تو وہ بھی اپنی جگہ پر کھڑی ہو کے زندہ باد کا نعرہ لگاتیں۔

ان یادوں کے حصار سے باقی سہیلیاں تو نکل ہی گئی ہوں گی مگر علینہ اکثر و بیشتر یاد ماضی میں گم ہو جاتی جس کی دو بڑی وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ باقی سہیلیوں کی ازدواجی زندگی بہت خوشحال تھی بال بچے سیر سپاٹے جبکہ علینہ کی شادی بتیس سال کی عمر میں ہوئی جب وہ خود بھی مایوس ہو چکی تھی..... شوہر اس کے بھائی کا دوست تھا عمر میں بھی زیادہ حکمت و دانش میں بھی صحت بھی اچھی تھی مگر مال زیادہ کیا بمشکل گزارے جوگا کما پاتا، پہلے کپڑوں کی دکان کھولی پھر کریانے کی اور جب چالیس سال کی عمر میں شاعرانہ ذوق رکھنے والی بتیس سالہ دلہن گھر لایا تو کریانے کی دکان سٹیل اور جرمن سلور کے برتنوں میں بدل چکی تھی۔

بچے بھی اسے اللہ نے سال کے سال چار عدد دیے۔ شوہر بھی بہت اچھا کہ روائتی شوہروں والی کوئی اکڑفوں نہیں تھی۔ بڑا ملنسار مرنجاں مرنج قسم کا انسان..... بے ضرر سا کبھی ماتھے پر بل آئے نہ ناک منہ چڑھایا..... خوش مزاج خوش گفتار۔ ادب سے قطعی دلچسپی بلکہ دور دور

تک علاقہ نہ تھا مگر بیوی کی دلجوئی کے لیے اس سے بے شمار شاعروں کے اشعار سنتا سر دھنتا واہ واہ کرتا۔ علینہ ..... جو بچپن لڑکپن کی طرح اب بھی طارق عزیز کی جاندار آواز شاندار تحت اللفظ میں اشعار کی ادائیگی کی مداح تھی ۔اگر کبھی وہ نیک بخت اسے امتحان میں ڈالتی شعر کا معنی مطلب پوچھ بیٹھتی تو کئی کئی منٹ اس کا منہ تکا کرتا۔

یہاں تک تو سب ٹھیک تھا۔ مارتو مالی کمی کی تھی جو خدا جانے کب تک اس کے مقدر میں رہنا تھی۔اس کا کاتب تقدیر کی لکھی دستاویز پر پورا یقین تھا وگرنہ سگے سات بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے مقدر میں لاڈ پیار کی بجائے چھوٹا ہونا ہی لکھوا کے آئی۔تین بھائیوں اور چار بہنوں میں سب سے چھوٹا اس کا گھر تھا۔ بچے اس کے سب سے چھوٹے تھے حالانکہ اس سے بڑی بہن نگینہ صرف دو سال بڑی تھی مگر جلد شادی ہونے کی وجہ سے اس کے بچے علینہ کے بچوں سے دس سال نو سال بڑے تھے۔رزق اس کا کم تھا سسرال اس کی کم تھی حلقہ احباب اس کا کم تھا..... سب بہن بھائیوں سے اس کے حالات مخفی نہ تھے مگر اس نے خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمیشہ خوشحال ہی دکھایا۔بہنیں اس کی زمیندار گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں۔ جب کبھی سال دو سال میں علینہ کی طرف چکر لگتا تو موسمی سوغات کے علاوہ دودھ، دہی اصلی گھی کے ساتھ گڑ شکر بھی عنایت کر جاتیں۔ بھائی بھی عید بکرا عید پر والدین کی قبروں پر فاتحہ خانی کے لیے آتے تو اس کے ہاں بھی چکر لگتا۔ بھلے کھڑے کھڑے آتے مگر آتے ضرور۔جاتے ہوئے چپکے سے بچوں کے ہاتھ پر نیلا نوٹ رکھ جاتے بہنوں سے نہ بھائیوں سے اس نے مقدر کا کبھی شکوہ نہ کیا اپنی اوقات سے بڑھ کر کھلایا۔ بھائی تعریف کرتے حال چال پوچھتے اور روانہ ہوجاتے۔صبر اور شکر کی جڑواں نعمتوں سے وہ پیدائشی مالا مال تھی اس لیے سب نے اس کے ہونٹوں کو مسکراتے ہی پایا۔زبان پر دوسروں کے لیے کلمہ خیر ہی نکالا تو بھلا اندر کا حال کون جان پاتا۔

ہاں مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا جب اس کے بہن بھائی بال بچوں سمیت آتے اپنے امیروں والے مشاغل بتاتے مہنگے مہنگے اینڈرائیڈ اور آئی پیڈ استعمال کرتے تو ان کے جانے کے بعد بہت دنوں تک اس کے گھر کی فضا سوگوار رہتی۔اس نے صبر کرنا سیکھا تھا نہ ملنے والی نعمتوں پر بھی شکر ہی کیا تھا مگر بچے تو بچے تھے۔ بے سمجھ۔دنیا کے مال متاع پر رال ٹپکانے والے۔اپنی خالاؤں اور ماموؤں کے بچوں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر حسرتوں میں مبتلا ہونے والے۔

علینہ بہت سمجھاتی بہترین مستقبل کے خواب دکھاتی مگر۔ بچے تو بچے تھے ناسمجھ۔انہیں ماں کے لمبے لمبے لیکچر کی بجائے بس وہ نوٹ لینا ہوتے جو ماموں ان کو دے کے جاتے اور ماں ہتھیانے کے چکروں میں ہوتی..... اب طارق عزیز کے الوداع ہونے کی خبر کیا ملی اس کا فل اتھل پتھل ہوا۔اس کا پورا ماضی چھم چھم روتا سامنے آ گیا اس کے دل کے اندر جیسے زخم ہو گئے ہوں گے..... وہ آنسو پی رہی تھی کہ چھوٹی سات سالہ بیٹی نمرہ نے اسے غمناک ماضی سے لا باہر کیا۔

''امی امی بھوک لگی ہے آپ نے ابھی کچھ نہیں بنایا ''۔نمرہ نے ماں کی آنکھوں میں چمکتے آنسو نہیں دیکھے۔

دس سالہ لبیب بھی بھاگا آیا۔ '' آج امی سارا دن واٹس ایپ پر لگی رہیں گی بچے بے شک بھوکے مر جائیں''۔

علینہ جھرجھری لے کے اٹھی..... سب سے آسان نسخہ چکن پلاؤ تھا بہن کے دیے آلو بھی سبزی کی ٹوکری میں موجود تھے..... یہ واحد مینو تھا ایک بوٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے وہ آرام سے تین چار بوٹیوں کے چاول اور آلو کے کباب بنا لیتی ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ بچے بھی شوق سے کھاتے چاول بھی بڑی آپا اپنی فچل کے بھجواتی تھیں تو وقت اچھا گزر رہا تھا..... ماضی کو فی الحال الوداع کہہ کے وہ باورچی خانے میں جانے کے لیے اٹھی صوفے سے اکھڑا کیل ایسے دوپٹے سے لپٹا کہ چررر کی آواز کے ساتھ دوپٹہ پھٹ گیا۔

''اُف یہ بیچارہ صوفہ مدت سے مرمت چاہتا ہے۔اچھا یہ کرونا کی مار ختم ہو تو ان سے کہوں گی ''۔دوپٹے کا دکھ کم کرنے کے لیے اس نے اپنے آپ سے کہا۔

باورچی خانے میں گئی تو پانی سے فرش بھرا ہوا تھا نل میں خرابی

تھی۔ چولھے کا برنر اتنا جواب دے چکا تھا کہ کئی کئی مرتبہ کوشش کے بعد جب جلتا تو شعلہ بھک سے لپکتا دو ایک مرتبہ وہ شعلے کی زد میں آتے آتے بچی تھی۔ یہ کمبخت مارا چولھا بھی نیا لینا پڑے گا مگر..... حالات پچھلے تین ساڑھے تین ماہ سے خراب سے خراب ہو رہے تھے۔ کرونا نے تو کھاتے پیتے لوگوں کے کس بل بھی نکال دیے تھے وہ کس کھاتے میں تھے .....لاک ڈاؤن میں بازار بند رہے بازار کھل گئے مگر ان کی دکان کھلنے کی نوبت کم کم ہی آئی..... کبھی چھاپہ پڑ جاتا اور کبھی کسی مشیر وزیر یا اے سی ڈی سی کے متوقع دورے کی وجہ سے بند کرنا پڑ جاتی۔ خوش مزاج میاں کے مزاج میں بھی اب پہلے جیسی مٹھاس نہ رہی تھی۔

بسم اللہ پڑھ کے اس نے ڈبے میں ختم ہوتے چاولوں میں سے دو گلاس مکمل کیے فریزر میں چکن کے نام پر تین چار مہین سی گردنیں تھیں وہ نکال کے چاول آلو کے کٹلس تیار کیے بچے بے تابی سے کھانے کے منتظر تھے جونہی کھانا چٹائی پر آیا وہ پلیٹ ہاتھ میں لے کے لپکے۔

''امی پہلے مجھے۔ پہلے مجھے۔ کی آوازوں میں اس نے کھانا نکال کے دیا ''۔ دو چار چمچ پیٹ میں گئے تو بڑے بیٹے عمیر کو باپ کا خیال آیا۔

''امی ابو کہاں ہیں؟''

''دکان کا سامان لینے گئے ہیں تھوڑی دیر تک آجائیں گے''۔ اس نے چاولوں والی پتیلی میں جھانکا۔ میاں کے لیے ننھی منی سی بوٹی پڑی تھی.....

''امی آپ بھی لیں ناں.....'' نمرہ نے ماں کی طرف دیکھا۔

''دل نہیں چاہ رہا بھوک نہیں ہے۔'' ایک دم طارق عزیز کی فوتگی کا دکھ پھر سے رگ و پے میں اتر گیا۔ اس کی ٹھوڑی تک آنسو بہہ رہے تھے۔

''امی آپ کو کیا ہوا ہے؟ '' نمرہ پریشان ہوئی۔

''امی کے پسندیدہ اینکر کی ڈیتھ ہوگئی ہے ''۔ چھوٹی نے لب کشائی کی۔

علینہ نے نہیں نہیں کہنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں کیا بات تھی، اتنا تو وہ معین اختر کے مرنے پر بھی نہیں روئی تھی۔

دل اندر ہی اندر سے غم کی گہری کھائی میں گرا جا رہا تھا۔

''فون..... کسی کا فون'' نمرہ نے دوڑ لگائی اور موبائل فون کی آواز سے سمت کا تعین کرتے ہوئے ڈھونڈ کے کانوں سے لگایا۔

''ہیلو جی ابرار بھائی جی..... کیا۔ ابو فوت ہوگئے ''۔ کی آواز سنائی دی سب بچے اس کی طرف لپکے۔

'' کیا ہوا کون مر گیا کس کا فون تھا؟'' طارق عزیز کے سوگ میں سرتاپا علینہ کو کچھ پتہ نہیں چلا کیا ہوا۔ عمیر چیخا۔

''امی ہمارے ابو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے وہ نہیں ہیں اب''۔

ایک دم چیخنے کی آوازوں سے وہ ہوش کی دنیا میں واپس آئی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا ایک دم دھڑ سے دروازہ کھلا اس کی بھتیجی اور بھابھی جو دو چار منٹ کے فاصلے پر رہتے تھے حواس باختہ اندر داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ہی گلی محلے کی عورتیں داخل ہوئیں۔ علینہ بے دم ہو کے گری۔ اگلے سات گھنٹوں میں سب ماں جائے بہن بھائی بھابیاں اپنے پرائے گھر میں موجود تھے۔

مگر علینہ کا سکتہ نہ ٹوٹا۔ وہ ٹکر ٹکر سب کی شکل دیکھ رہی تھی۔ کس نے فرنیچر نکالا کس نے دریاں منگوائیں کس نے بچھائیں کس نے کیا پرسہ دیا وہ سات گھنٹے اس کی زندگی کے سینتالیس سالوں پر حاوی تھے جو اس کی پندرہ سالہ زندگی کی مسکراہٹوں کو نگل گئے۔ اسے اپنے بچوں کی ہوش تھی نہ اپنی۔ بہنیں بھابیاں اسے جھنجھوڑتیں ''علینہ سلیم کا منہ دیکھو۔ دیکھو لگتا ہی نہیں بس چل گئی..... کتنا مسکراتا چہرہ ہے!''

''علینہ اٹھو ناں دیکھو سلیم کو بس تھوڑی دیر تک لے جائیں گے''۔

وہ ارد گرد سے بے نیاز ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔

چند گھنٹے قبل طارق عزیز کے انتقال کی خبر سن کے دھاروں دھار رونے والی کی آنکھ سے اپنے میاں کے لیے ایک آنسو نہیں نکل رہا تھا۔

''اس کی ذہنی حالت بہت خراب ہے بھائی جان۔ خدا کے لیے اس کا کچھ کریں ''۔ دو سال بڑی نگینہ خاور بھائی جان سے رو رو کے دہائی دے رہی تھی۔

دو تولے حق مہر کے عوض اس کی ازدواجی زندگی کا سفر اتنی جلدی

ختم ہوجائے گا یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا..... جو چیز سوچی نہ ہو اسے قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔اس وقت وہ زندگی کے مشکل ترین دور سے گزر رہی تھی..... اس کے اپنے سارے اس کے گرد بیٹھے تھے۔رو رہے تھے وہ بت بن گئی تھی سب اس کے لیے ہیولے تھے چار مرلے کے گھر میں سوڈیڑھ سو لوگوں کی گرمی سے سب بہت کھینچ کھینچ کے سانس لے رہے تھے۔اسے بھی سانس نہیں آرہا تھا۔مگر اس کی وجہ گرمی حبس یا ائرکولر کی مشینری چلنا نہیں۔اس کی وجہ اس کی زندگی کی آکسیجن ختم ہوجانا تھا۔ اس کی زندگی کی آکسیجن جس کا واحد واسطہ اس کا میاں تھا۔

''ہائے وہ زندہ کیسے رہے گی''۔ایک آواز آئی۔

''اللہ مسبب الاسباب ہے کوئی حیلہ وسیلہ خود ہی پیدا کرے گا''۔ دوسری آواز آئی۔

اس نے زندگی میں صبر کی اونچی گھاٹی پر پانی پیا تھا۔اس نے شکرانے کا پیالہ بھی بارہا منہ سے لگایا لیکن اب اسے صبر یاد تھا نہ بے صبری۔وہ تو ساکت تھی،مٹی کا مجسمہ.... وصبح والی خبر پہ اتنی ملول تھی اسے کیا پتہ تھا کہ زندگی کا سب سے بڑا غم سر پہ کھڑا ہے۔

پھر مہلت ختم ہوگئی۔سات گھنٹے گزر گئے۔عشاء کی نماز کے بعد جنازہ اٹھانا تھا۔بڑے تینوں بھائی لائن میں اندر آئے۔

'' گڑیا سلیم کو الوداع نہیں کروگی؟'' خاور بھائی بولے مگر وہ خالی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

بھائی روتے ہوئے آگے بڑھے۔

'' گڑیا کوئی ایسے بھی بھیجتا ہے! وہ تو چپ چپاتے چلا گیا تم ہی بولو۔روؤ گڑیا۔دیکھو کتنا پیارا لگ رہا ہے جیسے گلابوں کے دیس سے آیا شہزادہ۔کلمہ پڑھوناں ''۔

علینہ نے کلمہ پڑھا۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔'اب دیکھوناں سلیم کو''۔عابد بھائی جان نے آنسو پونچھے۔

وہ حیران ہوئی۔''آپ کہاں لے کے جارہے ہیں سلیم تو بالکل ٹھیک ہیں بھائی جان''۔

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے جیسی لمبی تھکاوٹ کے بعد سویا ہوا ہو''۔علینہ نے الفاظ دہرائے۔

''لمبی تھکاوٹ۔تھک گیا تھا واقعی سو رہا ہے''۔ایک دم وہ بپھری شیرنی کی طرح غرائی۔

'' کہاں لے کے جارہے ہو۔کوئی ہاتھ نہ لگائے سو رہا ہے سلیم ''۔

'' کلمہ شہادت ''۔ بھاری مردانہ ملی جلی آوازیں سنائی دیں اور چارپائی اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھے۔

''میں نے کہا ناں مت ہاتھ لگاو۔وہ کرلائی''۔

آپا نے اسے سینے سے لگایا۔سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑی بہن نے سب سے چھوٹی بیوہ بہن کو سینے سے لگایا۔

''صبر کرو علینہ صبر''۔

علینہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے آپا کو دیکھا۔

'' تو اور کیا کیا ہے میں نے اتنے سال۔صبر ہی تو کیا ہے۔ہائے میرے خدایا کیا ہوگیا میرے بچے یتیم ہوگئے ''۔سات گھنٹے کی چپ کا قفل ٹوٹ گیا،اب اس کے نوحے دلوں کو چیر رہے تھے وہ چارپائی کو مضبوطی سے پکڑے بیٹھی تھی۔

سب سے بڑے بھائی جان اس کے پاس آئے اس سے پندرہ سال بڑے۔جب وہ پیدا ہوئی تو وہ میٹرک میں تھے پھر تعلیم کے لیے دوسرے شہر میں چلے گئے۔چھٹیوں میں آتے تو بہن سے فاصلہ رہا۔تعلیم مکمل ہوئی تو بھابھی کے ساتھ زندگی کے آغاز میں علینہ بے ضرر سی کوئی تعلق نہ محسوس کرواسکی۔ان کے تو بچے بھی علینہ سے تھوڑا ہی بڑے تھے۔

انہوں نے اس کے سر کو اپنے سینے سے لگایا،چارپائی اٹھانے کا اشارہ کیا اور نرم نرم انگلیوں سے اس کا سر اس وقت تک سہلاتے رہے جب تک جنازہ کی چارپائی گلی کی نکر تک نہ پہنچ گئی۔

چار پانچ منٹ کے بعد بھائی جان نے اسے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھایا۔اس کی دلجوئی کے لیے چھوٹے چھوٹے فقرے بولتے رہے۔بچوں کو پاس بٹھایا عورتیں آہستہ آہستہ چھٹ رہی تھیں۔گرمی کی وجہ سے باہر ٹینٹ لگائے گئے تھے۔کھانے کے برتن دری پر رکھنا شروع کردیے گئے تھے اس کے دونوں بیٹوں کو بھائی جان نماز جنازہ اور تدفین کے لیے ساتھ لے گئے

تھے.....وہ بار بار غش کھا رہی تھی رو رہی تھی۔

''مجھ سے نہیں صبر ہوتا میرا دل پھٹ رہا ہے''۔وہ بار بار چیختی۔

بھابھی جان نے چھوٹے چھوٹے نوالے بنا کے منہ میں ڈالے روٹی سے کچھ آسرا ہوا اس کی آنکھیں کھلیں گرم گرم دودھ پتی کے ساتھ اسے درد اور سکون آور گولی دے دی گئی۔ پندرہ بیس منٹوں تک گھر والے تدفین کر کے واپس آئے تو وہ سونے جاگنے کی کیفیت میں تھی۔اسے نسبتاً ٹھنڈے کمرے میں لٹا دیا گیا تھوڑی دیر میں وہ اس نیند کو گلے لگا چکی تھی۔نیند جسے موت کی بہن کہتے ہیں!

اس کے سونے کے بعد آہستہ آہستہ سب رخصت ہوئے۔اس کا گھر تنگ اور شدید گرم تھا۔اے سی کی ٹھنڈک اور ہوادار کھلے گھروں میں رہنے والے وہاں چند گھنٹے مزید رکنے کی قربانی نہیں دے پا رہے تھے۔اس کی بہنیں اور دو بھابھیاں رک گئی تھیں۔ بڑی بھابھی کموڈ استعمال کرتی تھیں اس کے گھر میں کموڈ کی سہولت نہیں تھی۔ بہ امر مجبوری وہ رخصت ہوئیں۔

صبح تک جھٹکوں سے کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی لیکن نیند کی گولی کے زیر اثر پھر سو جاتی۔فجر کی اذان کے کافی دیر بعد خاور بھیا نماز پڑھ کے آئے تو ان کے ساتھ باقی دونوں بھائی بھی تھے۔سعودی عرب میں دس سالہ قیام نے خاور بھائی کو نمازی پرہیزی بنا دیا تھا۔فون پر بھی بات ہوتی تو دینی مسئلے مسائل ہی بتاتے رہتے۔

علینہ کی نیند بھی پوری ہو چکی تھی۔نگینہ ٹرے میں چائے کے مگ اور رس لے کے آئی۔سارے دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔لفظوں کے ہوتے ہوئے گونگے تھے۔علینہ بھی نماز پڑھ چکی تھی۔آخر خاور بھائی جان نے خاموشی توڑی۔

''رات کچھ نیند آئی علینہ؟''

''جی'' کہہ کے علینہ چپ ہو گئی تھی اس کا میاں جانے سے پہلے کوئی بینک بیلنس،کوئی منقولہ غیر منقولہ جائیداد چھوڑ کے جاتا تو شاید وہ ایک آدھ لفظ مزید بولنے کے قابل ہوتی۔اس کے دل و دماغ پر تو بیوگی کا غم اور بچوں کی یتیمی سانپ بن کے ڈنگ مار رہا تھا۔

''گڑیا کل میں حیران رہ گیا۔سلیم کے جنازے میں کوئی خلقت تھی کوئی خلقت تھی''۔انہوں نے دونوں بازو پھیلائے۔

''چاروں جانب سے لوگ دوڑے چلے آ رہے تھے۔وبا کا خوف نہ کوئی احتیاط.....بس لوگ امڈے چلے آ رہے تھے۔ایک سے بڑھ کے ایک گواہی دے رہا تھا۔وہ غریبوں بیماروں محتاجوں معذوروں کے بہت کام آتا تھا۔فرائض خواہ اللہ کے عائد کردہ ہوں یا بندوں کے وہ ہم سے بہت آگے تھا۔اب بھی آخری وقت میں جب بس سے اترا تو اپنے سے پہلے ایک بزرگ سواری کو اتارنے لگا۔ڈرائیور سمجھا دونوں اتر چکے ہیں لیکن تقدیر بھی وہی کرتی ہے جو لکھا ہوتا ہے۔اسّی نوے سالہ بہرا بابا بس سے بخیریت اتر گیا اور سلیم چلا گیا''۔

بھائی جان کی آنکھ سے گرم سلگتا آنسو نکلا۔سسکی لے کر بولے۔

''خدا کی قسم میں نے اپنے علاقے میں اس سے بڑا جنازہ نہیں دیکھا۔ہر بندہ صفت کر رہا تھا ہر بندہ رو رہا تھا۔میں تو کہتا ہوں اپنی جنت کما گیا بات تو ہماری عاقبت کی ہے ہماری جنت کے بند دروازوں کی ہے جسے ہم پانچ وقت کی نمازیں پڑھ کے حقوق ملکیت میں سمجھتے رہے''۔

''اور.....اور گڑیا تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا۔اپنی عاقبت بناتی گئیں ہماری برباد ہوتی گئی۔ مجھے تو معلوم ہی نہ تھا وہ بہن جو سال دو سال کی تھی تو میں پڑھنے کے لیے چلا گیا واپس آیا شادی ہوئی سعودی عرب چلا گیا.....وہ اتنی تنگی میں گزارا کر رہی ہے۔تمہیں بھی اپنا بھرم زیادہ عزیز تھا.....ہونا بھی چاہیے تھا،بے حسی تو ہماری ہے کہ کبھی تم ہماری فکرمندی کا مرکز نہ رہیں.....یہ سانحہ جو رات ہوا یہ تمہاری کم ہماری زیادہ آزمائش ہے۔اب ہمارا امتحان ہے تمہارے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔میں تو کہتا ہوں اللہ نے ہمیں جہنم میں گرنے سے بال بال بچا لیا۔ہم تینوں بھائی رات ساری رات جاگتے رہے ہیں،ایک سیکنڈ کے لیے نہیں سوئے۔ہمیں لگتا ہے ہم اب اس عمر میں پل صراط پر پیر رکھ بیٹھے ہیں''۔

خاور بھائی بچوں کی طرح روئے پھر آنسو پونچھ کے بولے۔

''میں نے اپنے نئے گھر کی شفٹنگ دو دن قبل شروع کی

ہے۔ پہلے والا دس مرلے کا گھر فروخت ہونے کے لیے پراپرٹی ڈیلر سے بات کی تھی ۔ایک دو اچھی پارٹیاں بھی آئیں لیکن سودا ہو کے منسوخ ہوگیا۔شاید اس میں یہی حکمت ہوگی ۔وہ مکان ساز وسامان سمیت اب تمہارا ہے ۔رہنے کو تم میرے گھر میں بھی رہ سکتی ہو،مگر میں چاہتا ہوں تمہارا اپنا گھر رہے تا کہ شوہر کے جانے کا احساس اور نہ بڑھے۔پھر جہاں دو برتن ہوں تو کھنکتے بھی ہیں، میں نہیں چاہتا خدا کی ڈالی آزمائش کے بعد تم پر بندوں کی طرف سے آزمائش آئے ۔نوید تمہارے سودا سلف کا ذمہ دار ہے اور منیب تمہارے بچوں کی خبر گیری کا۔تمہیں معلوم ہے دیوار کے ساتھ دیوار ملی ہوئی ہے۔میں بچے اور تمہاری بھابی تمہاری مکمل خبر گیری کریں گے..... پریشان نہیں ہونا،تمہارے اپنے تمہارے ساتھ ہیں''۔

وہ جواباً کچھ نہ کہہ سکی، بس آنکھوں سے جھڑی بہتی رہی،ایک مختلف احساس کے ساتھ۔ بھائی جان سمجھے تامل کر رہی ہے۔

''خدا کے لیے ہمیں اپنی کوتاہیوں کی تلافی کرنے دو ،جانے والے کو تو ہم نہیں لا سکتے لیکن جو کچھ ہماری دسترس میں ہے اسے تو دونوں ہاتھوں سے نچھاور کر سکتے ہیں۔اگر عدت میں یہاں رہنا لازم ہے، میں مفتی صاحب سے پوچھوں گا ،تو ہم سب باری باری یہیں رہیں گے لیکن اگر شریعت میں گنجائش نکلتی ہوئی تو بے شک اسی ہفتے شفٹ ہوجاؤ''۔

علینہ نے بہتے آنسو رخساروں سے صاف کیے اور قطعیت سے بولی۔

''بھائی جان اللہ آپ کو جزا دے میں یہاں سے نہیں جاؤں گی عدت میں..... یہ گھر سلیم کی نشانی ہے اور عدت یہاں گزارنا میری نظر میں لازم ہے ''۔

''تو ٹھیک ہے نا چندا! ہم کونسا تمہیں مجبور کر رہے ہیں..... جب تک تم ادھر ہو میں بھی ادھر ہوں گھر تو دونوں بہوؤں نے سنبھالا ہی ہوا ہے''۔ اس بار آپا نے تسلی دی تھی۔

تعزیت کے لیے محلے کی عورتیں آنا شروع ہوگئی تھیں اور علینہ کا دل مضبوط تھا۔اس سوچ کے آنے پر..... کہ اس نے تو صرف ایک دفعہ ابھی دعا میں اللہ سے خیر مانگی تھی تو اللہ نے سارے بہن بھائیوں کی طرف سے خیر کے دروازے کھول دیے اور اگر وہ مستقل اسی آقا کے در کی سوالی ہوجائے گی تو شاید خیر اس کے گھر میں ڈیرے ہی ڈال لے۔نظریں اور دل بہن بھائیوں کے لیے شکر اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز تھا۔تقدیر کا لکھا کوئی ٹال نہیں سکتا مگر اس کے بہن بھائی اسے مل گئے، ان کی گم شدہ محبتیں واپس آ گئیں۔باقی مال وزر تو جو لکھا ہے وہی ملے گا یہ کس کو نہیں معلوم!

☆☆☆

حبیب الرحمٰن

کُنوَر

پہلی مرتبہ مجھے یہ احساس ہوا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے لیکن میں اس گمان کو یقین میں نہیں بدل سکتی تھی، اس کے لیے مجھے بار بار مڑ کر دیکھنا پڑتا اور میرے اس اضطراری فعل کے سبب آس پاس سے گزرنے والے نہ جانے کیا مطلب اخذ کرتے۔

اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے میں نے بڑی احتیاط سے ماحول کا جائزہ لیا تو مجھے اپنے آس پاس کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ میں سوچ میں پڑ گئی کہ کیا یہ سب میرا وہم تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں ہے۔

گھر آ کر حسبِ معمول میں نے اپنے والد کی خیریت معلوم کی، میرے والد کئی برس سے معذوری کا شکار تھے۔ والدہ کو سلام کیا جو ایک اچھی گھریلو خاتون کی طرح اپنے روزمرہ کے کاموں میں خوشی خوشی مصروف نظر آئیں۔ میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تا کہ اپنے آفس کے لباس سے نجات حاصل کر سکوں اور نہا دھو کے سارے دن کی تھکن اتاروں۔

میں اپنے ماضی کو بھلانا بھی چاہتی تو نہیں بھلا سکتی تھی۔ خاندان بہت مختصر سا تھا، میں تھی، والدہ تھیں اور میرے والد۔ ویسے تو میری والدہ اور والد کا خاندان بہت ہی وسیع تھا اور مجھے سارے خاندان کے افراد خاندانی ہی لگتے تھے، بہت با اخلاق، پڑھے لکھے اور ملنسار۔ میرے والد اور والدہ کی عزت بہت ہی زیادہ کی جاتی تھی، اس کی وجہ جہاں خاندان والوں کا اعلیٰ اخلاق تھا وہاں والد اور والدہ کے اپنے مزاج، کردار اور اخلاق کا بھی بہت دخل تھا۔

والدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے باوجود ایک مکمل گھریلو خاتون تھیں، ۔والد صاحب بے شک صرف ڈپلومہ ہولڈر تھے لیکن بہت اعلیٰ مکینک تھے، ان کی اپنی تین ورک شاپس تھیں اور کئی اعلیٰ کاریگران کی زیرِ نگرانی کام کیا کرتے تھے۔ مارکیٹ میں ان کی بہت اچھی شہرت تھی اور ایک معقول آمدنی ہمارے گھر میں آیا کرتی تھی جس کے سبب ہمارا گزارا بہت مناسب انداز میں ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اسلامی گھرانے کے خود بھی چشم و چراغ تھے اور ساری اسلامی اقدار کے خود بھی پابند، اور سب سے بڑھ کر والدین کا حسن سلوک عزیزوں اور رشتہ داروں کے علاوہ اڑوس پڑوس والوں کو بھی گرویدہ کیے ہوئے تھا۔

یہ سچ ہے کہ نظر بھی لگ جایا کرتی ہے۔ والد صاحب کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا، اپنے کارخانے میں توسیع کی خاطر ایک مِلنگ مشین اور خریدی تھی، اس کو ٹرک سے اتار رہے تھے کہ اچانک سارا بوجھ ان پر ہی آ گیا۔ سب لوگ مدد کو دوڑے، مشین تو سنبھال لی لیکن والد صاحب نہ سنبھال سکے اور لہرا کے گر پڑے۔ ایمبولنس کے ذریعے ایک اچھے ہسپتال پہنچایا گیا تو معلوم ہوا کہ کئی مہرے ہل گئے ہیں۔ بس وہ دن اور آج کا دن وہ صاحبِ فراش ہیں لیکن قربان جاؤں ان کی شکر گزاری کے کہ آج تک ان کو اللہ کا شکر گزار ہی پایا کبھی بے صبری میں کوئی گلہ کرتے نہیں دیکھا۔ قربان جاؤں اپنی والدہ کے کہ جب بھی ان پر نظر پڑی والد کی خدمت کرتے دیکھا، پہلے تو اکثر وہ اہلِ محلّہ اور دیگر رشتے داروں کے ہاں ہو آیا کرتی تھیں لیکن والد صاحب کی معذوری کے بعد تو وہ ہر فارغ لمحہ ان کے قریب ہی گزارتی نظر آئیں۔

شاپ پر کام کرنے والے سارے کاریگر اور مددگار بھی بہت ہی اچھے انسان ثابت ہوئے۔ جو منافع حاصل ہوتا بہت حساب کے ساتھ گھر آ جایا کرتا لیکن میرے والد صاحب نے ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ سب مل جل کر اس کو اپنی ملکیت بنا لیں تو وہ بھی اپنے فرض سے سبک دوش

ہو جائیں گے۔ وہ سب تو ایسا نہ کر سکے لیکن ایک دن ایک پارٹی نے والد صاحب سے رابطہ کر کے تینوں ورک شاپ خریدنے کی خواہش ظاہر کی، والد صاحب ان کی پیشکش سے بھی مطمئن نظر آئے لیکن انھوں نے سوچنے کے لیے دو دن کی مہلت مانگ لی جس پر پارٹی کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ والدہ نے پوچھا کہ جب پارٹی نے پیشکش بھی آپ کی خواہش کے مطابق کی تھی تو آپ نے تردد کیوں کیا؟ مسکرا کر بولے، میری شاپس پر کام کرنے والے سارے چھوٹے بڑے میری اولاد کی طرح ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان سے بھی پارٹی کے متعلق دریافت کرلوں کہ کیسے لوگ ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی روٹی روزی پر کوئی آنچ آئے۔ روپیہ پیسہ آنی جانی چیز یں ہیں لیکن کسی کی روزی کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سن کر والدہ کی آنکھوں میں تو آنسو آئے ہی آئے میری آنکھیں بھی فرطِ جذبات سے ابل پڑیں اور میں اللہ کے حضور سجدہ شکر بجالائی کہ اس نے مجھے کتنے اچھے والدین عطا کیے ہیں۔

اگلا دن چھٹی کا تھا اس لیے سب چھوٹے بڑے ملازمین گھر پر آ گئے اور ان سب نے یہی کہا کہ پارٹی نیک شریف لوگوں کی ہے اور اس نے یقین دلایا ہے کہ ہم میں سے کوئی ملازمت سے فارغ نہیں کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر سب اشکبار ہو گئے۔

والد صاحب نے نم آلود نظروں سے ان کی جانب دیکھ کر دعائے خیر کے لیے ہاتھ بلند کیے اور پردے کے پیچھے ہم ماں بیٹیوں نے بھی آنسوؤں کی برسات میں دعائے خیر کے لیے ہاتھ بلند کر دیے۔

ابھی میں مارکٹنگ میں ماسٹرز کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ والد صاحب کے ایک بہت ہی پرانے دوست گھر پر آئے اور والد صاحب کے پاس خاصا وقت گزار کر رخصت ہو گئے۔ میں اپنے بچپن ہی سے ان سے واقف تھی، لیکن ان کے آنے اور اتنا وقت گزارنے کو میں کوئی نام نہ دے سکی۔ میری سوچ عام لڑکیوں کی طرح نہیں تھی اس لیے میں بہت زیادہ دیر اسی ایک خیال پر الجھی بھی نہیں رہی اور دیگر کاموں میں مصروف ہو گئی۔ رات والد صاحب نے بلایا تو میں دھڑکتے دل کے ساتھ ان کے کمرے میں گئی۔ مجھ سے بیٹھنے کو کہا تو میں سرہانے کے قریب بڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ والد صاحب نے مجھے پیار بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔

یہ جو میرے بہت پرانے دوست ہیں ان سے تو تم بچپن سے واقف ہو۔

جی! میں نے ہلکے سے کہا۔

یہ اس شہر کے بہت بڑے اسلامی کتب کے پبلشر ہیں، اس بات کا تو تمہیں علم ہی ہو گا۔

جی! میں نے ایک بار پھر بہت دھیمی آواز میں کہا۔

ان کو ایک دیانتدار اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے۔ تمہارا ایم بی اے کرنا ان کے علم میں ہے، خواہش ظاہر کی ہے کہ تم یہ عہدہ قبول کرلو۔ یہ سن کر خواہ مخواہ اٹھنے والا طوفان تو تھم گیا لیکن نئی پیشکش بھی ایک اور سونامی لگا۔ بہرحال میں نے یہ پیش کش منظور کر لی اور کام شروع کیا۔

چند روز میں ہی مجھے اپنی جاب اور اس کا ماحول اچھا لگنے لگا۔ جتنے بھی لڑکے لڑکیاں، عورتیں مرد اس ادارے میں تھے سب ہی کام کے مطابق پاکیزہ ماحول میں ڈھلے ہوئے تھے۔ خواتین اور مردوں کا الگ الگ انتظام تھا اور میرے لیے تو ایک چھوٹا سا کمرہ الگ ہی تھا۔ چند دنوں میں ہی میں اپنے کام کو بخوبی سمجھ چکی تھی اور والد صاحب کے دوست میرے کام سے بے حد خوش اور مطمئن نظر آتے تھے۔

ایک دن مجھے اس ادارے میں ایک جانا پہچانا چہرہ بھی نظر آیا۔ یہ والد صاحب کے کارخانے میں کام کرنے والا ایک نوجوان تھا۔ والد صاحب کے کارخانے میں جتنے افراد کام کرتے تھے میں ان سب سے واقف تھی اس لیے کہ میں بچپن میں اکثر وہاں جایا کرتی تھی۔ اس وقت یہ بچہ ہی ہوا کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ والد صاحب بھی کہتے تھے کہ مجھے بھی یہ کبھی اچھا نہیں لگا لیکن میں نے آج تک اسے کسی برائی میں نہیں پایا۔ دکان کی فروخت تک میرے والد کی رائے اس کے متعلق ایسی ہی رہی کہ وہ مجھے بھی اچھا نہیں لگتا لیکن میں نے کبھی اس کو کسی بری عادت کا شکار نہیں دیکھا۔

فرم کے مالکان سے اس نئی انٹری کے متعلق سوال کیا تو معلوم ہوا کہ وہ جس کارخانے میں کام کرتا تھا انہوں نے اسے فارغ کر دیا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ والد صاحب سے جس نے کارخانہ خریدا تھا اس نے اسے آگے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ گویا اس نے اپنے ملازمین میں سے نہ جانے کیوں اس کو فارغ کر دیا ہے۔

یہاں اس کا کیا کام ہے، وہ تو بس ایک مکینک ہے؟ میں نے حیرت سے سوال کیا تو ادارے کے مالک نے مجھے بہت غور سے دیکھا لیکن ان کا جواب سن کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ انھوں نے کہا۔

کارخانے کے مالک نے بس اسی کو فارغ کیا ہے کہ یہ اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہ تمہارے والد کے پاس گیا تھا، والد کو بہت دکھ ہوا پوچھا تم اور کیا کیا کام کر سکتے ہو، کہنے لگا کہ میں بہت سارے سافٹ ویئر پر کام کرنا جانتا ہوں، کمپوزنگ کر سکتا ہوں، بہت اسپیڈ ہے، کورل ڈرا اور فوٹو شاپ کا ماہر ہوں۔ ان کو اس کی بات پر یقین تو نہیں آیا لیکن انھوں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے لیے کچھ کرتے ہیں۔ مجھ سے جھجکتے ہوئے ذکر کیا تو میں نے آزمائش کے لیے اسے رکھا لیکن معلوم ہوا کہ میرے پاس جتنے بھی کام کرنے والے ہیں یہ ان سب سے زیادہ ماہر ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے اسے مستقل بنیادوں پر رکھ لیا۔

ان کو خوشی ہوئی ہوگی لیکن میرے لیے یہ سب کچھ حیرت کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

علم تو اس کو بھی رہا ہوگا کہ میں بھی یہاں ہوں لیکن مجھے اس کی کسی بھی حرکت سے اس قسم کے گمان کو یقین میں بدلنے کا موقعہ نہیں مل سکا۔ آتے جاتے میں اسے اپنے کام میں مگن ہی پاتی لیکن میری لڑکیوں والی حس یہی کہتی تھی کہ وہ میری ہر جنبش کی خبر رکھتا ہے۔

آج بھی مجھے وہی گمان ہوا تھا اور اس حد تک ہوا کہ جیسے کسی بات کا یقین ہوتا ہے لیکن میں نے عملاً کسی کو بھی اپنے تعاقب میں نہیں پایا۔

چند دن قبل ادارے میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوا۔ شکل سے وہ پاکستانی نہیں لگتا تھا لیکن تھا پاکستانی، بہت نیک سیرت اور خوش گفتار، لیکن اس کی قربت میں عجیب سا اضطراب محسوس ہوتا تھا۔ یہ بھی کوئی حس ہی ہوگی، میں نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا۔ اس کا آنا جانا کبھی بھی غیر ضروری نہیں ہوا، اور نہ ہی وہ کبھی براہِ راست میرے پاس آیا۔ جب بھی آیا ادارے کے مالک ہی نے اس کو میرے پاس بھیجا اور اس نے کام کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں کی لیکن اکثر اس کی یہ پیشکش کہ آئیں میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔ ایسا اکثر وہ مجھے کسی رکشا ٹیکسی یا بس کا انتظار کرتے دیکھ کر اپنی گاڑی کی کھڑکی سے جھانک کر کہتا تو میں اس کی اس نازیبا حرکت پر دل ہی دل میں کٹ کر رہ جایا کرتی تھی۔

جب پہلی مرتبہ اس نے ایسی پیشکش کی اور میں نے ناگواری کا اظہار کیا تو مجھے اس کی آنکھوں میں اپنے لیے کوئی اچھا پیغام نہیں ملا لیکن مجھے کوئی خوف بھی محسوس نہیں ہوا بلکہ ایسے موقع پر اپنے والد کا پیار سے مجھے ''کُنور'' کہنا یاد آ گیا اور مجھے یوں لگا کہ میں واقعی شہزادہ ہوں، راجہ کا لڑکا ہوں، مرد ہوں۔

یہی وہ پہلا دن تھا کہ جب مجھے یہ گمان ہوا کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے مگر کون؟ وہ بھی پیدل؟ وہ موہنی صورت والا شخص تو اپنی گاڑی میں ہوتا ہے تو پھر یہ کون ہے جس پر میں تعاقب کا شبہ کر رہی ہوں؟۔

یہ احساس تھا، گمان تھا یا دھوکا، یہ الجھن میری جا کر نہیں دے رہی تھی اور وہ معصوم اور موہنی صورت لیکن کردار کا ناپختہ اور کسی غلط فہمی کا شکار کسی حد تک تکلیف دہ بھی ہوتا جا رہا تھا گو کہ اس پیش کش کے بعد اس نے کبھی دوبارہ ایسا نہیں کیا لیکن جب بھی آتے جاتے سر راہ گزر سامنا ہوتا اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے کوئی اچھا پیغام کبھی نہ ملتا۔

میں اکثر سوچا کرتی کہ میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ چھپا کر رکھا، والد صاحب تو مجھے ''کنور'' کہتے ہی تھے لیکن میری اس ستر پوشی اور حجاب کے اپنانے پر والدہ اکثر ''لاجونتی'' کے خطاب سے پکارتی تھیں۔ والد صاحب کنور کے معنی پوچھنے پر صرف مسکرا کر رہ جاتے تھے، میں بڑی ہوئی تو لغت میں کنور کے معنی معلوم ہو کر خود بھی مسکرائی کہ والد صاحب مجھے راجہ کا بیٹا یا شہزادہ کہنے کی بجائے ''کنور'' کہا کرتے تھے لیکن امی نے لاجونتی کے معنی پوچھنے پر بتایا کہ لاجونتی حیا والی، غیرت والی اور پاک دامن خاتون کو کہا جاتا ہے۔

بس یہی شہزادہ کہلایا جانا، شرم و حیا و غیرت دار ہونا ہی میری

راہ میں حائل رہا ورنہ کئی مرتبہ دل میں یہ خیال ابھرا کہ اپنے والد کے سامنے اپنے موجودہ حالات رکھوں۔ پھر یہ سوچ کے رہ گئی کہ ان کو ان کی معذوری میں کیا پریشان کروں، کیوں نہ ''کنور'' بن کر دکھاؤں۔

کئی مرتبہ میں نے یہ چاہا کہ والد صاحب کے نیک طینت دوست اور اس ادارے کے مالک سے رائے معلوم کروں کہ ان کا اس موہنی شکل وصورت والے جوان کے متعلق کیا خیال ہے لیکن ان کا سامنا ہوتے ہی بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی لیکن آج میں نے فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ اس کے سلسلے میں بات ضرور کروں گی۔

اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ وہ میرے آفس میں خود ہی آ گئے اور اپنا مدعا بیان کر کے جانے ہی والے تھے کہ میں نے اشاروں اشاروں میں اس کا ذکر چھیڑ ہی دیا، وہ میری بات کو سمجھ کر خاموش سے ہو گئے، جاتے جاتے رکے اور بغیر میری جانب مڑے ہلکے سے بس اتنا ہی کہا کہ محتاط رہنا اور کمرے سے چلے گئے۔

ان کا یہ جملہ میرے ذہن میں طوفان کھڑا کر گیا۔ کیا مسئلہ ہے؟ وہ اگر کوئی ناپسندیدہ فرد ہے تو ادارے میں کیوں ہے؟ اتنا پاکیزہ ادارہ کس گرداب میں پھنس گیا ہے، اس ادارے سے کتنے بڑے بڑے اسلامی اسکالر وابستہ ہیں، کتنے افراد دیگر فرائض انجام دے رہے ہیں، کسی قسم کا ہیر پھیر میں نے نہ تو دیکھا اور نہ ہی محسوس کیا، پھر اس ادارے کا سربراہ کیوں پریشان اور بے بس دکھائی دیا۔

پوری دنیا کی ہوا ایسی بدلی ہے کہ ہر نیک اور اچھا کام کرنے والا فرد ہو یا ادارہ، دباؤ میں آیا ہوا ہے، مسلمان پوری دنیا میں اپنا وقار کھوتے جا رہے ہیں اور ان کی نگرانی کڑی سے کڑی ہوتی جا رہی ہے۔ شاید یہ معاملہ اس ادارے کے ساتھ بھی درپیش ہو اور وہ موہنی صورت والا فرد بھی یقیناً اس پریشانی کی ایک کڑی ہے اس لیے ادارے کے سربراہ نے محتاط رہنے کا کہا ہے۔

آج کام کا دباؤ کچھ زیادہ ہی آ گیا تھا، صرف وہ ہی نہیں، پورا ادارہ ہی کام میں مصروف تھا، والد صاحب کے دوست نے مجھے بھی دو تین گھنٹے زیادہ کام کرنے کے لیے روک لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے اس کے والدین کو آگاہ کر دیا گیا ہے، کام کرنے والے خواتین وحضرات کے ساتھ ایسا ہوا ہی کرتا ہے اس لیے کسی نے اس بات پر کسی بے چینی کا اظہار نہیں کیا۔

سورج غروب ہونے میں بہت زیادہ دیر نہیں رہ گئی تھی جب مجھے اور دیگر افراد کو گھر جانے کی اجازت ملی، والد صاحب کے دوست نے چند خواتین جس میں میں بھی شامل تھی، ان کے لیے ہائی روف کا انتظام کر دیا تھا کہ وہ انھیں گھر چھوڑ آئے۔ ساری خواتین راستے میں اتر گئی تھیں اب میں اکیلی تھی اور ہائی روف میرے گھر کے قریب ہی تھی کہ اچانک ایک کار نے سامنے آ کر اس طرح راستہ روکا کہ ڈرائیور گاڑی کو بمشکل ایک خوفناک حادثے سے بچا سکا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو بصد مشکل سیٹ سے گرنے بچا سکی۔

گاڑی تو حادثے سے بچ گئی لیکن ایک اور حادثہ سر پر سوار تھا، اپنے اصل رنگ روپ میں یہ وہی موہنی صورت والا جوان تھا اور میں نے اس کی کار کو بھی پہچان لیا تھا۔ کار سے نکل کر اب وہ میری گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا اور خوف سے میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ''موہنا ناگ'' میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ہائی روف سے کھینچتا، ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سوار لہراتا ہوا آیا اور باہر کھڑے اس جوان کو ٹکر مارتا ہوا اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا۔

ہلکے سے اندھیرے میں میں اتنا ہی دیکھ سکی کہ زمین پر گرا ہوا شخص لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

یہ سب کچھ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر ہوا۔ میں بدحواسی میں یہ دیکھے بغیر کہ ہائی روف والا اپنے حواس میں بھی ہے یا نہیں گھر کی جانب دوڑ پڑی۔

آخر کو میرا خطاب ''کنور'' تھا اس لیے جب میں گھر میں داخل ہوئی تو معمول پر آ چکی تھی لیکن میں ایک فیصلہ کر چکی تھی کہ اب گھر ہی میں رہوں گی، ایسا خطرہ مول لینے سے بہتر ہے کہ گھر رہا جائے۔

اگلی صبح میں معمول کے مطابق ہی اٹھی، ناشتہ کرنے کے باوجود بھی جب میں وہیں بیٹھی رہی تو والدہ نے کہا، آج آفس نہیں جاؤ گی؟

نہیں، گویا اس طرح میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ والدہ نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ مجھے ایسا لگا کہ جیسے انھیں میرے اسی قسم کے جواب کی توقع رہی ہو۔ اتنے میں والد صاحب کی آواز آئی ''کنور!''

میں اٹھ کے ان کے پاس گئی تو وہ آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اخبار کے ایک حصہ کو میری جانب بڑھا دیا۔ خبر اور تصویر پر میری نظر پڑی تو میں اپنے اضطراب کو نہیں چھپا سکی۔ ہماری ہی شاہراہ کا حوالہ تھا، کار ایکسیڈنٹ کی خبر تھی، مرنے والے کی تصویر بھی تھی۔ یہ وہی موہنی صورت والا خبیث انسان تھا۔ تفصیل میں اس بات پر حیرت ظاہر کی گئی تھی کہ مرنے والا کس کی ٹکر سے اتنا زخمی ہوا تھا کہ اپنے ہوش میں گاڑی ڈرائیو نہ کر سکا اور سامنے سے آنے والے روڈ رولر سے ٹکرا کر اس کی گاڑی اور وہ خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ خبر میں لکھا تھا کہ مرنے والا غیر ملکی ایجنٹ تھا، اس کے کاغذات سارے جعلی تھے اور وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مطلوب تھا۔

ابھی میں خبر پڑھ کر فارغ ہی ہوئی تھی کہ میرے والد نے اسی اخبار کا ایک اور حصہ دیا جس میں اسی شاہراہ کے حوالے سے ایک اور خبر بھی تھی کہ ایک موٹر سائیکل سوار شاہراہ کے درمیان بنے نالے میں موٹر سائیکل سمیت زخمی حالت میں پایا گیا، پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ نیچے دی ہوئی تصویر دیکھ کر میں سن سی ہو کر رہ گئی۔ یہ تو وہی، نہ سمجھ میں آنے والا مگر ہنر مند بچہ تھا جو پہلے میرے والد کے پاس کام کیا کرتا تھا اور اب میرے ہی ادارے کا باہنر ملازم، جس کی صورت بھی مجھے پسند نہیں تھی۔

جب میں اپنی سوچ سے باہر نکلی اور چاہا کہ سب کچھ صاف صاف بتا دوں کہ میں کیوں اپنی ملازمت پر نہیں جانا چاہتی اور کل میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے لب کھولے ہی تھے کہ والد صاحب نے مجھ پر ایک اور بجلی گرا دی۔

بس بیٹے! مجھے سب کچھ معلوم ہو گیا۔

کیا معلوم ہو گیا؟ مارے حیرت کے میری آواز بلند تھی۔

والد صاحب نے کہا، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جانا خلاف واقعہ نہیں، میں تو تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ تم نے ہمیں اس حادثے کی خبر بھی نہیں ہونے دی۔

پھر آپ کو سب خبریں کس نے دیں؟ میں نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

رات تم خلاف معمول زیادہ ہی گہری نیند سو رہی تھیں کہ اس ادارے والے میرے دوست گھر پر آئے۔ ان کے ساتھ پولیس کے اعلیٰ عہدیداران بھی تھے۔ میں بہت پریشان ہوا لیکن انھوں نے میری مشکل آسان کر دی اور کہا کہ ہم آپ کی، آپ کی بیٹی اور یہ کہہ کر میرے دوست کی جانب اشارہ کر کے کہا ان کی، پوری ہسٹری سے واقف ہیں۔ معاملہ حساس نوعیت کا تھا، ادارے کی عزت کا ہی نہیں اسلام کا بھی سوال تھا۔ یہ شخص جو اپنے انجام تک پہنچا پڑوس کا جاسوس تھا لیکن ہمارے پاس اس کے لیے کچھ بھی شواہد نہیں تھے۔ یہ دوسرا بچہ جو کبھی آپ کے پاس تھا ایک شہید پولیس آفیسر کا حاضر ڈیوٹی خفیہ کا آفیسر ہے لیکن پہلے یہ آپ کی شاپ پر بھیجا گیا تھا تا کہ مارکیٹ کی نگرانی کر سکے اور آپ کی حفاظت بھی اس لیے کہ بہت سارے ایجنٹ اسی طرح کے چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہیں کیونکہ ایسا کام کرنے والوں کے کوائف عام طور پر پوچھے نہیں جاتے۔ وہ کل کا بچہ اور آج کا جوان آپ کے گھر تک آپ کی بچی کی حفاظت کیا کرتا تھا، اس کے علم میں مر جانے والے ایجنٹ کی ساری حرکتیں تھیں، کل ہونے والی کارروائی کا اس کو علم ہو گیا تھا اس لیے وہ ہر حالت میں آپ کی بچی کی حفاظت کرنا چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہا۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور امید ہے وہ جلد اپنے فرائض ادا کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ ہم تو محض اس لیے آئے ہیں کہ آپ کو اور آپ کی بیٹی کو ہر معاملے سے دور رکھیں۔

والد صاحب اپنی بات مکمل کر چکے تھے لیکن میں اس سوچ میں گم تھی کہ ''کنور'' کون ہے؟ میں..... یا وہ..... جس نے فرشتوں کی طرح میری حفاظت کی اور جس کی شکل وصورت مجھے کبھی اچھی نہیں لگی۔

اپنی پرانی رائے اور سوچ پر میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ بہہ کر میرے آنچل میں جذب ہونے لگے۔

☆.....☆.....☆

دانش یار

خالی صندوق

جلال گڑھ ایک پرانا گاؤں تھا جہاں کسانوں کی آبادی کھیتی باڑی کر کے اپنی روزی کماتی تھی۔ چودھری امام دین اوران کے بھائی شکر دین ایک مربع یعنی پچیس ایکڑ رقبہ کے مالک تھے۔ وقت کے ساتھ وہ اپنے اپنے حصے کی زمین پر الگ الگ کاشت کاری کرنے لگے۔ امام دین کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ جب کبھی ان میں وراثتی جائیداد تقسیم ہوئی تو ان میں سے ہر ایک کے حصے میں بہت تھوڑا رقبہ آتا تھا اور یہ گزارہ یونٹ نہ بن سکتا تھا۔

امام دین کے چھوٹے بیٹے نذیر نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ جنگ عظیم دوم شروع ہو چکی تھی۔ انگریز حکمران ہندوستان کے سپاہی کے بارے میں جانتے تھے کہ یہ لوگ تھوڑی تنخواہ اور معمولی سہولتوں پر جان ہتھیلی پر رکھ لینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ ان کے اپنے گورے سپاہی اعلیٰ درجے کا راشن اور سہولتیں طلب کرتے تھے۔ اس لیے برطانوی فوج میں وہ انگلش سٹائل خوراک اور دیگر سہولتیں دیتے تھے جس پر کثیر رقم خرچ ہوتی تھی۔ لیکن ہندوستان میں مقامی سپاہی (Native Soldiers) بھنے ہوئے چنے اور گڑ سے ناشتہ کر کے مستعدی سے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان کی اقتصادی بدحالی کے تحت محض انگریز کی نوکری ہی ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

امام دین نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے نذیر کو بھرتی ہونے کی اجازت دی اور وہ فوجی بن کر ہر ماہ پندرہ روپے والد کو منی آرڈر کرنے لگا تو امام دین گاؤں میں چودھری بن کر بیٹھتا تھا۔ لیکن جنگ ختم ہوئی اور بہت سے فوجی ملازمت سے فارغ کر دیے گئے۔ نذیر بھی گھر آ گیا لیکن ملازمت کے دوران اُسے ٹی بی کا مرض لگا اور وہ جلدی سے جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ دوران ملازمت انگریز حکمران کی سفا کی آڑے آئی اور انہوں نے اپنے جاں نثار فوجی کے علاج سے غفلت برتی اور اب چودھری امام دین پھر ایک عام سا دہقان ہی رہ گیا۔

اس کے بڑے بیٹے عنایت نے گاؤں میں کریانہ کی دکان بنالی۔ اوران کا بڑا شہر اگرچہ گاؤں سے پچیس تیس میل دور تھا۔ سڑکیں کچی تھیں، لوگ گدھے گھوڑے ہی آمد و رفت کے لیے استعمال کرتے یا اکثر پیدل چلا کرتے، عنایت نے کوشش کی اور دو اونٹ خرید لیے۔ دیہات سے اجناس خرید کر وہ اونٹوں پر لاد کر غلہ منڈی ضلعی ہیڈ کوارٹر لے جاتا، اس طرح یہ تجارت اس کے لیے اچھا ذریعہ معاش بن گئی۔ وہ ایک تنومند جفا کش نوجوان تھا۔ اپنے اونٹوں پر سامان لادنے میں اُسے ایک سو سیر (2½ من) کی بوری لادنے میں دقت نہ ہوتی تھی۔

بُرے دن شاید اس کے تعاقب میں تھے، ان کے گاؤں میں پہلوان شیرا ہوتا تھا جسے اپنی تنومندی اور طاقت پر زُعم تھا اور وہ اکثر دوسروں سے اپنی رعونت کے باعث توہین کا سلوک کرتا تھا۔ ایک دن چودھری امام دین اپنی زمین سے واپس آ رہا تھا تو شیرا نے اُسے بھی نازیبا الفاظ سے مطعون کیا۔ حالانکہ امام دین نے اُسے کبھی منہ نہ لگایا تھا۔ اس کی اس حرکت پر امام دین کے بھائی شکر دین اور اس کے بیٹے عنایت کو صدمہ ہوا اور انہوں نے شیرا کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔ شکر دین نے عنایت سے کہا کہ تم اُس سے اکیلے نہ الجھنا میں مناسب وقت پر اسے سیدھا کرنے کا فیصلہ کروں گا۔ عنایت کو بھی یہ خیال تھا کہ وہ اپنے اونٹوں پر بھاری بوجھ لادنے اور اتارنے کے سبب کافی طاقت رکھتا ہے اور وہ اکیلا ہی شیرا سے نپٹ سکتا ہے۔

ایک شام وہ اپنی زمین سے واپس گاؤں آ رہا تھا کہ راستے میں شیرا سے اس کا ٹاکرا (آمنا سامنا) ہو گیا۔ اس سے رہا نہ گیا اور اس نے

شیرا کو للکارا۔ وہ بھلا اپنے زُعم میں کسی کو کب خاطر میں لانے والا تھا۔ اُس نے مقابلہ کی ٹھانی اور کافی دیر دونوں گتھم گتھا رہے لیکن عنایت نے اُسے گرالیا اور اُس کا گلا گھونٹ کر اُسے ابدی نیند سلا دیا اور خود اطمینان سے گھر آ گیا۔ گاؤں والوں کو شیرا کی امام دین کے ساتھ گستاخی کا علم تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی شیرا کو نتھ ڈال سکتا ہے تو وہ شکر دین یا اس کا بھتیجا عنایت ہی ہو سکتے ہیں۔

گاؤں کے چوکیدار نے نمبردار کی طرف سے اگلے روز پولیس تھانے جا کر اطلاع دی کہ ان کے گاؤں کے باہر شیرا کی لاش پڑی ہے اور قاتل کا علم نہیں۔ پولیس نے اپنی کارروائی کی اور پھر لاش شیرا کے ورثا کے حوالے کر دی۔ بظاہر گاؤں میں کسی نے قاتل کی مخبری نہ کی لیکن پولیس نے اپنے ذرائع سے یہ طے کر لیا کہ اس قتل کا شک امام دین کے بھائی اور بیٹے پر ہو سکتا ہے انہوں نے عنایت کو حراست میں لے لیا۔ عنایت کے گرفتار ہو جانے پر اس کی دکان بند ہو گئی اور دوسرے بھائی اونٹ سنبھال سکے نہ دکان۔ اس لیے امام دین نے اپنے بیٹے کو رہا کرانے کے لیے اونٹ بیچ دیے۔ کوئی ڈیڑھ سال مقدمہ چلنے کے باوجود پولیس عنایت پر قتل کا الزام ثابت نہ کر سکی اور وہ بری ہو کر اپنے گھر آ گیا لیکن اب وقت بدل چکا تھا۔ ملک تقسیم ہوا، حالات کی یہ تبدیلی امام دین کے گھرانے کے لیے معاشی بدحالی کا دور لے کر آئی۔ اس نے اپنے بہنوئی چودھری حاکم دین سے رابطہ کیا جو چند سال پہلے گنجی بار میں برطانوی حکومت کی نو آباد کاری اسکیم کے تحت ایک مربع زمین لے کر رہ رہا تھا۔ دونوں پہلے سے باہم رشتہ دار تھے اور حاکم دین نے اپنے دوسرے بیٹے کی شادی امام دین کی بیٹی سے کر دی۔ حاکم دین کا یہ بیٹا بھی اس کی وفات کے بعد کاشتکاری اپنے چھوٹے دو بھائیوں کے سپرد کر کے خود تجارت کرنے لگا اور زرعی اجناس، مویشی، درخت اور گاؤں سے گڑ، شکر، دیسی گھی خرید کر شہر بھجواتا اور دیگر کاشتکاروں کے مقابلے میں یہ گھرانہ خوش حال ہو گیا۔ قسمت کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں چند سال کی تجارت کے ذریعے سلیم نے اپنے مرحوم والد کے قرضے اتارے اور خاندان کو سنبھالا۔ اپنے سب سے چھوٹے بھائی عبدالرحیم کو اس کی تعلیمی منازل طے کرانے میں پوری مدد کی اور دو ایکڑ زمین بھی خریدی۔ اور بڑے بھائی کی دو بیٹیوں کی شادی بھی ٹھاٹھ سے کی چھوٹے بھائی کے لیے ان کے ماموں چودھری امام دین نے اپنی دوسری بیٹی بھی عبدالرحیم کے عقد میں دینے کو کہا جسے بھلا کون انکار کر سکتا تھا۔ اور یہ شادی بھی سلیم نے اپنے تجارتی منافع سے انجام دی۔ جب اپنے خاندان کے اتنے بڑے بڑے کام مکمل ہوئے تو دوسرے بھائی کریم کو بھی جاٹوں کے رواج کے مطابق دھوم دھام سے بیاہ دیا۔

اس کے دو ہی سال بعد یکا یک سلیم میاں کو سینے کے امراض نے ایسا جکڑا کہ وہ کوئی کاروبار کرنے کے قابل نہ رہا۔ انہی سالوں میں سلیم کے بھائی اپنا اپنا حصہ کی زرعی زمین لے کر الگ ہو گئے۔ اور سلیم کی زمین مزارعت پر چلی گئی جس سے قلیل مقدار میں کچھ یافت ہوتی تھی اور اگلے دس بارہ سال سلیم نے نہایت مسرت سے گزارے۔ اس کی اہلیہ جو امام دین کی بڑی بیٹی تھیں، صبر و قناعت کے ساتھ اپنے بچوں، اپنی ساس جو پھوپھی بھی تھیں اور شوہر کی خدمت کرتی رہیں۔ سلیم کے ہاں آس پاس کے لوگ اکثر مہمان آتے تو سلیقہ مندی سے انہیں بھی تواضع کے بغیر نہ جانے دیا جاتا۔

عنایت مقدمے سے بری ہوا تو اس کے حصے کا زرعی رقبہ سولہ سترہ کنال تھا جس سے گزر اوقات مشکل ہو گئی۔ اسے کہیں سے یہ معلوم ہوا کہ تھل کے علاقے میں جن لوگوں کو سستے داموں زمینیں ملی تھیں ان میں سے کئی زمیندار اپنی زمین دوسروں کو ٹھیکے پر دے دیتے۔ عنایت نے بھی کوشش کی تو اسے تحصیل بھر کے ایک گاؤں میں پچاس ایکڑ کا ایک قطعہ اراضی ٹھیکے پر مل گیا اور عنایت اپنا سامان ٹرک پر لاد کر بیوی بچوں سمیت تھل روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی فہیم کو بھی تیار کیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے اس کا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا اور ایک بھینس اور دو بیل اسی ٹرک میں ڈال کر بھکر والے گاؤں آ گئے۔

کئی سال کی شبانہ روز محنت سے بھی یہ رقبہ عنایت اور فہیم کے لیے نفع آور ثابت نہ ہوا۔ سب سے بڑی دقت پانی کی تھی۔ وہاں نہری پانی کی آٹھویں دن باری سے دو تین ایکڑ بھی سیراب نہ ہوتے۔ ٹیوب ویل وہاں بہت مہنگا ثابت ہوتا تھا۔ اس صورت نے بھکر والے ان دونوں

بھائیوں کی معاشی حالت ابتر ہی رکھی اور گزر بسر میں جو دشواریاں تھیں ان کے باعث وہ کنگال ہی رہے۔

باوجود اقتصادی بدحالی کے سلیم نے اپنے بچوں کو سکول جانے سے نہ روکا۔اس کے بڑے بیٹے نے تعلیم مکمل کی اور اپنی تحصیل میں ایک دفتر میں دوسو روپے ماہوار پر ملازم ہوگیا۔اسی وقت سلیم کے چھوٹے بھائی نے اس کے ملازم بیٹے سے اپنی بیٹی بیاہنے کا کہا۔سلیم کی والدہ بھی اپنے بیٹے کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے سلیم اور اس کی بیوی کو جو اس کی اپنی بھتیجی تھی منا لیا۔ ہر چند سلیم کہتا رہا کہ ابھی میرے بیٹے کو ملازمت ملے چند ماہ ہوئے ہیں کہ پچھلے دس بارہ سال کی بیماری اور بیکاری نے میرا بال بال قرض میں جکڑ لیا ہے۔ میں شادی کے اخراجات کی ابھی سکت نہیں رکھتا لیکن اس کی والدہ نے دوسرے بیٹوں کو ساتھ ملا کر سلیم کو اپنے بیٹے کی شادی پر تیار کرلیا۔البتہ سلیم نے برملا کہہ دیا کہ مجھ سے زیورات، بری کے جوڑے اور اگلے دن کے مہمانوں کی تواضع کے لیے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے۔

شادی طے ہوگئی اور عنایت چونکہ سلیم کی بیوی کا بڑا بھائی تھا اُسے مدعو کرنا ضروری تھا۔سلیم کے سسر چودھری امام دین بڑھاپے کی لاغری کے سبب سفر نہ کر سکتے تھے اس لیے وہ نہ آسکے۔جب سلیم کا پوسٹ کارڈ عنایت کو ملا تو وہ اپنے بھانجے کی شادی میں شرکت کے لیے تیار ہوگیا۔ اس نے اس تقریب کی اطلاع کا ذکر اپنی بیوی سے کیا۔وہ کہنے لگی۔

''آپ کو معلوم ہے کہ میری نند اور ان کے شوہر ہماری بیٹی کی شادی پر آئے تھے تو انہوں نے بچی کے تین قیمتی جوڑے دیے تھے، آپ کا اور میرا بھی ایک ایک جوڑا لائے تھے۔کوئی پندرہ سیر لڈو بھی انہوں نے ہمیں دیے تھے۔اب ان کے بڑے اور پہلے بیٹے کی شادی ہے۔آپ کیا لے کر جائیں گے ہمارے ہاتھ تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں؟''

عنایت نے کہا''جانے کی صورت میں سوائے میری بہن اور ان کے خاندان کے لوگوں ہی کو پتا چلے گا کہ ہم خالی ہاتھ گئے تھے۔دوسرے لوگ مجھے وہاں دیکھ کر یہ گمان کریں گے کہ میں کچھ خصوصی تحائف لے کر پہنچا ہوں''۔اس نے بیوی سے کہا''وہ ٹین کا سبز ٹرنک مجھے دے دو۔میں اپنی بیٹی سکینہ کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گا۔کرائے کی رقم میں سردار دکاندار سے ادھار لے لوں گا اور جب واپس آؤں گا تو وہاں سے ہمیں جوڑے ملیں گے اور کچھ مٹھائی بھی ہوگی''۔

''اچھا خیال ہے لیکن یہ بات لوگوں میں مشہور ہوجائے گی کہ دلہا کا ماموں خالی ہاتھ آیا ہے اور آپ کو خبر ہے کہ وہاں آپ کی چھوٹی بہن بھی رہتی ہے جو ہمیشہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ کھنچی کھنچی رہتی ہے۔جب کہ دلہا کی ماں نے ہمیشہ اس کے اور اس کے بچوں اور شوہر کے کپڑوں کو ہر اتوار کو دھویا ہے۔اور وہ اپنی چھوٹی بہن کی باتوں کا بُرا نہیں مناتی۔اس بہن نے پہلے آپ کے ٹرنک کی تلاشی لینی ہے اور اس میں بند مٹھائی میں سے بڑا حصہ وہ نکال لے جانا چاہے گی''۔

ایسے ہی خیالات میں سکوت اختیار کر کے وہ لیٹے اور صبح سویرے اٹھے۔دونوں باپ بیٹی نے سڑک پر جا کر آنے والی بس کو ہاتھ کے اشارے سے رکوایا اور اس میں سوار ہوگئے۔اور شام کو سلیم کے گاؤں پہنچ گئے۔جونہی ان کی چھوٹی بہن نے سنا کہ اس کے بڑے بھائی بھکر سے آگئے ہیں تو وہ بلا تاخیر اپنی بڑی بہن کے ہاں پہنچی اور اپنی بھتیجی سکینہ کو مل کر اسے اندر لے گئی اور اُسے پوچھا:

''تمہارا ٹرنک کہاں ہے؟''

سکینہ نے اپنی چھوٹی پھوپھی کو اشارے سے بتایا کہ''وہ بڑی پیٹی کے اوپر رکھا ہے''۔اس نے لپک کر اس صندوق کو اوپر سے کھینچ کر نیچے چارپائی پر گرالیا اور بے صبری سے کھول کر دیکھا جس میں کچھ نہ تھا۔

اُس نے باہر بیٹھی اپنی بڑی بہن کو اندر بلایا اور غراتے ہوئے کہا:

''تو نے بھائی جان کے آنے کے فوراً بعد ان کا صندوق خالی کر کے ہر چیز چھپالی ہے اور مجھے مٹھائی کا ایک دانہ نہیں دیا''۔

اس کی بہن نے بتایا''ہمارے بھائی تھل میں بڑی مشکل سے گزارا کرتے ہیں۔ان کا تشریف لے آنا ہی میرے لیے مبارک ہے''۔

''میں نہیں مانتی''۔اس کی دیورانی اور چھوٹی بہن بضد رہی کہ ''چھپائی'' گئی مٹھائی نکال کر میرا نصف حصہ میں تو لے کر ہی جاؤں گی۔ اس کی بڑی بہن نے اسے بتایا کہ وہ بھائی بڑے ضرور رہے ہیں لیکن بہت

کٹھن حالات میں تھل میں رہ رہے ہیں۔تم ان کی پوزیشن کا احساس کرو اور نہ دوسرے لوگوں کو یہ بتاؤ کہ آپ کے بھائی جان بہت مناسب تحائف لائے ہیں.....لیکن بیگم سلیم کی کسی بات پر اس نے یقین نہیں کیا اور اول فول بکتی پاؤں پٹختی لوٹ گئی۔اپنی دونوں جٹھانیوں کو اس نے بتایا۔

''میری بہن نے میرے بھائی جان کی طرف سے آنے والے تحائف اور مٹھائی چپکے سے چھپا لی ہے اور مجھے ایک دانہ تک نہیں چکھایا''۔

شادی کا مرحلہ اگلے دو دنوں میں طے ہو گیا۔اور پھر عنایت نے واپسی کے لیے کہا۔اس کی بڑی بہن اپنے بیٹے کی شادی پر رشتہ داروں کو رواج کے مطابق کپڑے اور لڈو نہ دے سکی۔اس نے اپنی حالت زار کا از خود کسی رشتے دار کو کچھ نہیں بتایا لیکن سارے خاندان والوں کو سلیم کی مالی ابتری کا علم تھا۔انہوں نے اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے دباؤ میں آ کر اپنے بیٹے کی شادی کی تھی۔سارے لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔

جب عنایت اور اس کی بیٹی سکینہ واپس بھکر والے گاؤں پہنچے اور انہوں نے اپنے ساتھ والا صندوق وہاں رکھا تو اس کی بیوی نے شرماتے جھجکتے صندوق کی طرف دیکھا،اس کو تالا نہیں لگایا گیا تھا۔جاتے آتے وہ یہ خالی صندوق اٹھائے ہوئے تھے۔اس کی بیوی نے خالی صندوق دیکھا تو کہنے لگی۔

''مجھے ان کی غربت کا علم تو تھا۔لیکن میں اتنا گمان نہ رکھتی تھی کہ وہ بیٹی سکینہ کو بھی دو کپڑے نہ دے سکیں گے''۔

اس کے شوہر نے سر جھکا رکھا تھا۔اسے معلوم تھا کہ وہ کہنے کے لیے خود بھی دو بول نہیں بول سکتا۔اسے اب یقین آیا کہ اس کا بہنوئی طویل بیماری کے باعث کتنا مفلوک الحال ہو چکا تھا۔اسے اپنی غربت اب بُری معلوم نہ ہوئی۔اُسے یہ ماننے میں کوئی عار محسوس نہ ہوئی کہ دنیا میں ایسے حالات اس کے علاوہ کسی اور کے بھی ہو سکتے ہیں۔مالی بدحالی کا یہ دور گزر جائے گا۔تھوڑی مدت کے بعد میری بہن کا بیٹا کمائی کا ایک ذریعہ بن کر والدین کی خدمت میں تنخواہ پیش کیا کرے گا تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔☆

صائمہ اسما

تزئین حسن سے ایک ملاقات

بتول کی مضمون نگار تزئین حسن نے اس سال ہارورڈ یونیورسٹی سے صحافت میں ماسٹرز امتیازی اعزاز کے ساتھ مکمل کیا۔ان کا نام ان بارہ نمایاں طلبہ میں شامل تھا جن کے کام کا تذکرہ خصوصی طور پر موجودہ اور آئندہ طلبہ کے لیے مثال کے طور پر کنووکیشن کے موقع پر کیا گیا۔ہم ان کی کامیابی پر فخر محسوس کرتے ہوئے انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔آپ ان کی تحریروں کے ذریعے تو ان سے متعارف ہیں ہی،مگر اس موقع پر ہم نے ان سے سوالات کے ذریعے تفصیلی بات چیت کا اہتمام کیا۔

س: تزئین آپ کو اس کامیابی پر دلی مبارکباد۔ پہلا سوال فطری طور پر یہی ہے کہ آپ کے کیا احساسات ہیں؟

ج: گریجویشن بلاشبہ میرے علمی سفر کا ایک اہم سنگ میل تھا جس کا میں شدت سے انتظار کر رہی تھی۔مگر ڈین لسٹ میں نام آنا یعنی کنووکیشن کے موقع پر میرے کام کا تذکرہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ سچی بات ہے میں نے خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا اس لیے بہت زیادہ خوشی کا احساس ہوا۔ بلا شبہ یہ اللہ ہی کی مہربانی ہے۔ مجھے جس ای میل کے ذریعے ہارورڈ اسپاٹ لائٹ کے اعزاز کی اطلاع دی گئی اس کے مطابق:

''ہم ہر سال ان گریجویٹس کو ماڈل بناتے ہیں جو غیر معمولی وسیع اور گہرا تجربہ لے کر ہارورڈ آتے ہیں۔ یہ منتخب گریجویٹ ہمارے موجودہ اور مستقبل کے طلبہ کا جذبہ بڑھانے کے لیے حقیقی زندگی سے ایسی مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں جنہوں نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے رکاوٹیں توڑیں اور قربانیاں دیں۔ یہ اعزاز حاصل کرنے پر ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں''۔

یہ سطریں صرف میرے لیے نہیں بلکہ بطور پاکستانی طالب علم میرے ملک کے لیے اعزاز ہے۔ ہارورڈ سے ماسٹرز مکمل کرنے میں شاید میری محنت کا کوئی دخل ہو لیکن ہارورڈ کی ویب سائٹ پر میرے انٹرویو کی اشاعت اللہ کے فضل اور والدین کی دعاؤں کے بغیر ممکن نہیں تھی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پروردگار کی بہت شکر گزار ہوں اور آگے کے سفر میں ہدایت کی طلب گار۔اللہ نے اگر کوئی صلاحیت دی ہے تو وہ سیدھے راستے پر رکھ کر اسے استعمال کروالے۔ یہ سب ظاہری کامیابیاں ہیں،اصل کامیابی یہی ہے کہ ہماری حقیر کوششوں کو اللہ قبول کرلے ان میں برکت ڈال دے اور معاشرے میں مثبت تبدیلی کا باعث بنادے۔ربّنا تقبّل منا۔

س: اس سفر میں اپنی کامیابی کا کریڈٹ کس کو دیتی ہیں؟

ج: سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کو جنہوں نے سب کچھ پلان کیا۔اگر شاید میں اپنی زندگی پلان کرتی تو ٹیلی کام میں پی ایچ ڈی کے بعد کسی انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہوتی۔ میں شعوری طور پر یہ محسوس کرتی ہوں کہ ایک تکنیکی ماہر کے مقابلے میں ایک صحافی اور لکھاری کے طور پر میں امت کے کاز پر زیادہ مؤثر طور پر کام کرسکتی ہوں۔ہمیں اس شعبے میں آنے والوں کی بہت ضرورت ہے۔

اللہ کے بعد بلاشبہ اس کامیابی کا سب سے زیادہ کریڈٹ میرے والدین کو جاتا ہے جنہوں نے دین اور علم سے محبت کی بنیاد ڈالی کیونکہ میرے کام کے پیچھے ہمیشہ یہی دو قوتیں غالب رہیں۔اس کے بعد میرے شریک حیات جنہوں نے شادی کے بعد سے اب تک ہر طرح سے میری علمی اور فکری سرگرمیوں میں تعاون کیا۔اپنے بچوں کی جنہوں نے اپنی تعلیمی مصروفیات سے وقت نکال کر کچن اور گھر کی ذمہ داریوں اور پڑھائی میں بھی میری مدد کی۔

یہ پیچیدہ سفر تھا اور اس مرحلے پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ

بہت سوچ بچار کے بعد یہ بات سمجھ آتی ہے کہ جس چیز کو ہم یہودی اور مغربی سازش کہتے ہیں یہ دراصل ان
کی تحقیق کی مضبوط روایت ہے، یہی ہماری بھی بقا کا راستہ ہے جسے اختیار کرنے سے ہم گریزاں ہیں

صرف ماسٹرز کی تعلیم پر محیط نہیں تھا۔ میں نے بچپن سے لے کر آج تک جو کچھ سیکھا، جو علم حاصل کیا، جن کتابوں کو پڑھا، جن رویوں کا مشاہدہ کیا، جو تجربات حاصل کیے، جو مشکلات اور رکاوٹیں عبور کیں، جن مخالفتوں کا سامنا کیا اور جو دعائیں کیں وہ سب اس سفر میں شامل تھیں۔

میری پھپھو بتاتی تھیں کہ میری دادی کی جس وقت شادی ہوئی وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں۔ میرے دادا کی پہلی مرحومہ بیگم کے بچے اسکول سے آتے تو دادی ان سے سبق لیتیں یعنی اپنی سوتیلی اولاد کو انہوں نے سیکھنے کا ذریعہ بنایا۔ میری والدہ بتاتی ہیں کہ پچھتر سال کی عمر میں جب دادی کا انتقال ہوا تو ان کا یہی شوق تھا کہ وہ فارغ وقت میں رسائل کا مطالعہ کرتیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے اپنے حصول علم کا سفر بھی اس وقت شروع ہوا جب میری دادی نے اپنی خواندگی کے لیے کوششیں شروع کیں۔

بیسویں صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں انڈیا سے حج پر جانے والے مرد بھی انگلیوں پر گنے جاتے تھے۔ دادا جب دوسرے حج پر جانے لگے تو دادی نے کہا میں بھی ساتھ چلوں گی، میں نے گھر کے خرچ سے پیسے جوڑے ہیں۔ سب سے چھوٹے دودھ پیتے بیٹے کو ساتھ لیا اور باقی بچوں کو اپنی بہن کے گھر چھوڑا۔ مجھے آج بھی سفر کے حوالے سے اپنے رویہ میں اپنی دادی کی جھلک نظر آتی ہے۔

کچھ اور لوگوں کا تذکرہ بھی یقیناً ضروری ہے۔ میرے مرحوم ماموں ظفر سلمان جنہوں نے مجھے چار سال کی عمر میں بانگ درا تحفے میں دی۔ بہت چھوٹی عمر سے ابو اور امی دونوں گاہے بگاہے مجھے کلام اقبال مطالب کے ساتھ سناتے تھے۔ کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے، یا رب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے دل میں آگ لگ گئی تھی۔ آٹھ سال کی عمر میں ماموں جو سعودی عرب میں رہتے تھے پاکستان آئے تو مجھ سے کلام اقبال سنتے۔ ان کی پڑھائی ہوئی ایک فارسی ہدی (شاعری کی ایک صنف جس میں صحرائی سفر کے دوران اونٹوں پر سوار قافلے گیت گاتے ہیں)

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

مجھے آج تک یاد ہے۔ میرے پھوپھا کہیں بھی جاتے میرے لیے کتابیں لانا نہیں بھولتے تھے۔ میرے نانا جنہوں نے مجھے قرآن پڑھایا۔ قرآن پڑھانے والی میری پہلی استاد رابعہ آپا۔ میرے چچا جن کی لائی ہوئی پاکٹ کہانیاں وہ اولین کتابیں تھیں جو میں نے پڑھیں۔ اب یہ لوگ دنیا میں نہیں لیکن ان سب لوگوں نے بے انتہا محبت اور لگن کے ساتھ میری ذہنی تربیت میں حصہ لیا۔ دیگر کتنے ہی عزیز جنہوں نے بچپن سے میرے رجحان کو بھانپ کر میری حوصلہ افزائی کی۔ کتنے ہی مصنفین جن کی کتابوں نے علم و حکمت کے موتیوں سے نوازا۔ اس موقع پر ڈائجسٹ لٹریچر، فکشن، ڈراموں اور فلموں کا بھی تذکرہ کرنا چاہوں گی جنہوں نے حقیقتوں کو نئے زاویوں سے دکھایا اور inspiration کا باعث بنیں۔

قلیل تعداد میں سہی، لیکن میرے وہ دوست (جن میں ایڈیٹرز بھی سرفہرست ہیں) جنہوں نے ایسے بیانیہ پر بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا جو دنیا کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ میں ان سب مساعی کا مرکب ہوں، اس لیے اس کامیابی کا کریڈٹ میں اکیلے نہیں لے سکتی۔

س: حالات زندگی، شادی، بچوں کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میں نے حیدرآباد سندھ کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ہم چار بہنیں ہیں اور میرا نمبر دوسرا ہے۔ امی ابو دونوں نے اپنے بچپن میں بالترتیب بھوپال اور جودھ پور انڈیا سے ہجرت کی تھی۔ ابو یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اور دو کتابوں کے مصنف تھے۔ اسکولنگ برٹش راج کے زمانے کے ایک کیتھولک کانونٹ میں ہوئی جسے بھٹو کے زمانے میں نیشنلائز کر لیا گیا تھا۔ انٹر تک تعلیم حیدرآباد میں ہی حاصل کی۔ اس کے بعد ماموں اور نانا کے اصرار پر کراچی سے انجینئرنگ کی۔ اس دوران

ایک پولی ٹیکنک ادارے میں اور بعد ازاں دو انجینئرنگ یونیورسٹیوں میں مختصر عرصے تدریس بھی کی۔ مجھے اس بات پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ پرائمری اسکول سے لے کر انجینئرنگ اور بزنس کے اعلیٰ ترین اداروں میں تدریس کا موقعہ ملا۔ کچھ عرصے آئی ٹی کنسلٹینسی اور کارپوریٹ ایجوکیشن کا ذاتی بزنس بھی کیا۔ اس دوران ورلڈ بینک کے منصوبوں کے اسٹاف کی ٹریننگ پروجیکٹ آزادانہ طور پر ڈیزائن کرنے اور اپنی نگرانی میں مکمل کروانے کا بھی اللہ نے موقع دیا۔ میں سمجھتی ہوں ان تمام تجربات سے کچھ ٹرانسفر ایبل اسکلز حاصل ہوئیں یعنی ایسی اسکلز جو دوسرے شعبوں میں بھی کارآمد ہوسکتی ہیں۔

شادی مکمل ارینج تھی۔ حسن ڈاکٹر تھے اور چیسٹ میڈیسن میں اسپیشلائزیشن تھی۔ ہم نے شادی کے بعد ہی ایک دوسرے کو دیکھا۔ شادی کے بعد جیسا کہ ہوتا ہے، سسرال میں میری زندگی مکمل طور پر تبدیل ہوگئی۔ میرے گھر کے برعکس سسرال کا ماحول بہت روایتی تھا لیکن میرے سسر بہت ویژن والے انسان تھے۔ انہوں نے بیٹوں کے ساتھ ساتھ بیٹیوں کو بھی بہترین تعلیم دلوا کر اپنے پیروں پر کھڑا کیا۔ ایک حادثہ یہ ہوا کہ شادی کے بعد اچانک بلا ارادہ ''ان'' سے عشق ہوگیا۔ ان کی پسند کے کھانے بنانے سیکھے اور بہت جلد سیکھے۔ میک اپ کی بھی کلاسز لیں۔ انہیں روایتی کھانوں کے ساتھ چائنیز اور کانٹینٹل فوڈ بھی پسند تھا تو اسی زمانے میں نیشنل فوڈز کے ایک کھانا بنانے کے مقابلے میں چائنیز رائس پر دوسرا انعام حاصل کیا۔ بعد ازاں اے آر وائی کے مارننگ شو میں بھی ایک کوکنگ مقابلے میں پہلا انعام حاصل کیا۔ الحمدللہ میرے شریک حیات کی ترجیح بھی پڑھائی کا شوق رکھنے والی لڑکی ہی تھی۔ میرے کیریئر کو پہلا بریک اس وقت لگا جب پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ لوگوں نے کہا اپنا کیریئر کیوں خراب کرتی ہو، ڈے کیئر کس لیے ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت سوچا کیا قدرت نے یہ قیمتی پروڈکٹ ڈے کیئر کے لیے لانچ کروائی ہے؟ اگلے تین سال میں اللہ نے تین سیزیرین آپریشن سے تین بیٹیاں دیں جو قدرت کا بہت قیمتی سرمایہ محسوس ہوتی ہیں۔

پہلی بیٹی پانچ سال کی ہوئی تھی تو آئی بی اے انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن، کراچی میں ٹیلی کمیونیکیشن کی تحقیق اور تدریس کا موقع ملا۔ لیکن ابھی تین سمسٹر ہوئے تھے کہ شوہر نامدار کو سعودی منسٹری آف ہیلتھ میں ایک اچھی آفر ہوئی۔ حسن کا کہنا تھا پہلے تم اپنی تحقیق مکمل کرو پھر چلیں گے۔ لیکن حجاز میں رہائش میری دیرینہ خواہش تھی اور مجھے لگا بچے اس وقت چھوٹے ہیں تو وہاں کچھ سال گزارنا بچوں کے لیے اچھا ثابت ہو گا۔ وہاں جس شہر میں ہم رہے وہاں کوئی انگلش یا اردو میڈیم اسکول نہیں تھا۔ یہ بڑا چیلنج تھا تو ہوم اسکولنگ شروع کی۔ لوگ ڈراتے تھے کہ آپ کے بچے جاہل رہ جائیں گے مگر مجھے اعتماد تھا۔ الحمدللہ جب کینیڈا آ کر بڑی بیٹی پہلے دن اسکول گئی تو ہسٹری کے ٹیسٹ میں چوبیس میں سے پچیس نمبر آئے۔ پوچھا کیسے تو کہنے لگی ایک بونس سوال تھا جو اور کوئی نہ کر سکا۔ الحمدللہ میرٹ پر کینیڈا کی بیسٹ اکیڈمک رینکنگ کے اسکول میں بیٹیوں کا ایڈمشن ہوا۔ اس وقت دو بڑی بیٹیاں یونیورسٹی کے پہلے سال میں ہیں۔ چھوٹی ابھی ہائی اسکول میں ہے۔

شمالی امریکا منتقل ہونے کے پندرہ سال بعد ہارورڈ کیمپس میں ایک سمسٹر گزارا اور باقاعدہ ڈگری پروگرام میں ایڈمشن کے بعد کوئی چار سال میں ڈگری مکمل کی۔ اتنا وقت لینے کی ایک وجہ تو گھریلو ذمہ داریاں تھیں، دوسری وجہ یہ تھی کہ میں اس تمام عرصے میں مسلسل مختلف اخبارات اور رسائل میں سنجیدگی سے لکھتی رہی۔ الحمدللہ جنوبی ایشیا، مشرق وسطیٰ اور شمالی امریکا تینوں خطوں کے میڈیا میں اپنا حصہ ڈالا اور بہت مختلف النوع موضوعات پر ایک ساتھ کام کیا۔ کینیڈا میں امیگرنٹ تجربے پر ایک مجموعے کی تصنیف میں حصہ لیا جو ٹورنٹو سے شائع ہوا۔

یہ بھی کہنا چاہوں گی کہ اس سفر میں لاتعداد مشکلات، رکاوٹیں، تلخ رویے اور ناکامیاں بھی ہم رکاب رہیں مگر

یہ تو ہوتی ہیں تجھے اونچا اڑانے کے لیے

س: والدین کی تربیت میں کون سا عنصر غالب محسوس ہوتا ہے؟

ج: روایتوں کو چیلنج کرنا امی ابو دونوں کی تعلیمات تھیں۔ پھر سید مودودی کی تحریروں نے تو ذوق کو دو آتشہ کر دیا۔ والدہ بہت سیدھی سادھی گھریلو خاتون تھیں۔ ان کی سوچ گھسی پٹی نہ تھی۔ اردگرد کے سماجی مسائل پر غور و فکر کی اہلیت تھی۔ ہر معاشرتی روایت کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھتیں اور یہ اکثر کہتیں کہ ہماری سوچ ہندوؤں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے ایسی ہوگئی ہے۔ اسلام کی حقانیت کا شعور انہوں نے اس طرح گھٹی میں ڈال دیا کہ ہمیشہ اسی عینک سے ہر نظریے کو دیکھنے کی عادت ہے۔ ایک اور چیز جو امی سے ورثے میں ملی، وہ یہ کہ جس چیز کو حق سمجھو، اس کے لیے آواز اٹھاؤ۔ قرآن پر سنجیدگی سے غور و فکر کا موقع ملا تو بار بار انصاف کی بات کرنے کا حکم نظر آتا ہے چاہے اس کی زد اپنے والدین پر ہی کیوں نہ آتی ہو۔ اسی سبب نظریاتی طور پر میرے مسلک کے لوگ ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ میرے پیاروں کا اصرار یہ ہوتا ہے کہ دوسروں میں کوئی خرابی ہو تو اس کا ڈھنڈورا پیٹا جائے لیکن اپنے نظریے کے ماننے والوں کی خرابیوں کی پردہ پوشی کی جائے۔ میرے نزدیک یہ بنی اسرائیل کا رویہ ہے، پیارے رسولؐ کا نہیں۔

امی، ابو جتنی انٹلیکچوئل نہیں تھیں۔ پڑھنے کا بہت شوق تھا لیکن بی اے کے فوراً بعد شادی ہوگئی۔ انہیں ہم بہنوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلوانے کا بہت شوق رہا۔ دوسرے مقصد کو حاصل کرنے کی لگن اور اس کے لیے انتھک محنت بھی انہیں کا ورثہ ہے۔ مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں، مگر مجھے ہر روایتی چیز سے چڑ تھی۔ میری بے چین فطرت نے انجینئرنگ کا انتخاب کیا تو تھوڑی ردوکد کے بعد مان گئیں۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے کہ محض اپنے آپ کو منوانے کے لیے بھیڑ چال میں آ کر انجینئرنگ کا انتخاب کر بیٹھی انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران اسلامی جمعیت طالبات کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ سید مودودی اور تحریک اسلامی کے لٹریچر سے وہ کچھ سیکھنے کا موقع ملا جو آج بھی زادِ راہ کی طرح ساتھ ہے۔

مجھے یاد نہیں امی نے سونے سے پہلے کبھی پریوں کی کہانیاں سنائی ہوں۔ وہ ہمیشہ ہندوستان پر مسلم دورِ حکومت اور تقسیم ہند کے قصے سناتیں۔ انڈین پارلیمنٹیرین اور مصنف ششی تھرور کی کتاب کا آج کل بہت تذکرہ ہوتا ہے جس میں انہوں نے اعداد و شمار کے ساتھ ثابت کیا کہ انگریزوں نے ہندوستان کو کتنا لوٹا۔ یہ باتیں بغیر اعداد و شمار امی نے بچپن میں بتائیں۔ کس طرح بنگالی ململ بنانے والوں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے۔ بنگال کے مصنوعی قحط کے بارے میں بتایا۔ ایک کہانی جو مجھے یاد ہے وہ ملک ٹوٹنے کی تھی کہ بنگلا دیش کیسے بنا۔ گو امی کی بتائی حقیقتیں بہت سادہ ٹیکسٹ بک بیانیہ پر مشتمل ہوتیں مگر آج جب ان موضوعات پر کام کرتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ بچپن میں ہی ان سے جذباتی طور پر جڑ چکی تھی۔ البتہ ایک صحافی کے طور پر غیر جانبداری اور توازن ترجیح رہتا ہے۔ گرمیوں کی ایک رات ایک مرتبہ چھت پر مجھے وائرلیس کے بارے میں بتایا کہ بغیر تار کے پیغام رسانی ممکن ہے۔ حساب کرنے کے اپنے اختراع کیے ہوئے کچھ ایسے انوکھے طریقے بچپن میں بتائے جو آج ریاضی کے الٹرا ماڈرن تعلیمی نظام کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان طریقوں کی بدولت میری کوئیک میتھس اتنی اچھی تھی کہ میں ہمیشہ داخلے کے امتحانوں میں ٹاپ کرتی رہی۔

میرے والد کا رجحان بائیں بازو کی طرف تھا لیکن ان کے ذاتی نظریات سے قطع نظر انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کی طرح ہر نظریے کو شک کی نظر سے دیکھ کر پرکھنے کا سبق دیا۔ علم کی محبت دل میں ڈالنے میں سب سے بڑا کردار انھیں کا تھا۔ ہم نے انہیں ہمیشہ کتابیں پڑھتے دیکھا۔ ایک دفعہ مجھے کہا کہ کتابیں پڑھتے ہوئے سطور کے درمیان پڑھنے کی عادت ڈالو (Read Between the lines) یعنی ساتھ ساتھ تجزیہ کرتی رہو کہ مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے وہ عقل اور دلیل کے معیار پر پورا اتر رہا ہے یا محض لفاظی اور جذباتیت ہے۔ شاید اسی لیے جب سید مودودی کو پڑھا تو دلیل نے عقل کو چیلنج کیا اور اسلام شعوری طور پر قبول کیا۔ میرے انداز تحریر

مجھے یاد نہیں پڑتا امی نے سونے سے پہلے کبھی پریوں کی کہانیاں سنائیں ہوں۔ وہ ہمیشہ تقسیم ہند کے قصے سناتیں۔ششی تھرور نے اعداد وشمار دیے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو کتنا لوٹا، یہ باتیں بغیر اعداد وشمار امی نے بچپن میں بتائیں۔

میں بھی شاید اس نصیحت کا اثر ہے۔

رنگ نسل اور مذہب کی تفریق کے بغیر انسان کی عزت بھی انہوں نے سکھائی۔ کبھی نمبروں میں دلچسپی نہیں لی مگر اپنی علمی مصروفیت کے باوجود ویک ڈیز میں روز عصر سے مغرب تک ہمیں پڑھاتے۔ تاریخی حقائق کا بیک گراؤنڈ بتاتے، ہر چیز کا مطلب سمجھاتے۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی رٹا نہیں لگایا اور نہ کبھی نمبروں پر توجہ رہی۔ بغیر سمجھے کوئی بات نہ کبھی لکھی نہ بولی۔

اس کے ساتھ دوسرے کے جوتے میں اپنے پیر ڈال کر دیکھنے کی بھی تعلیم دی کہ مخالفین کے نظریات اور موقف کو ان کی نظر سے حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھنے کی بھی کوشش کرو۔ اس نصیحت کا یہ اثر ہؤا کہ کبھی اللہ کے بندوں سے نفرت نہیں کی چاہے ان کا تعلق کسی بھی قوم یا مذہب سے ہو۔ سید مودودی نے شاید اسی چیز کو ایسے بیان کیا کہ نفرت مرض سے ہونی چاہیے مریض سے نہیں۔

تاریخ سے شدید لگاؤ بھی ایسا لگتا ہے خون میں دوڑ رہا ہے۔ تاریخ سے محبت کا بیک گراؤنڈ بھی ابو کے سنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے دلچسپ قصے رہے جو وہ غیر رسمی گفتگو میں سناجاتے تھے۔ مجھے اپنی زندگی کی پہلی کہانی یاد ہے جو ابو نے مجھے چھوٹے کوٹھے پر ایک بان کے پلنگ پر لیٹ کر سنائی، وہ کہانی حضرت یوسفؑ کو کنویں میں ڈالنے سے متعلق تھی۔ ان کا فلسطین سے مصر پہنچنا اور بنی اسرائیل کو وہاں منتقل کروانا اور پھر حضرت موسیٰ کا سمندر کے راستے واپس بنی اسرائیل کو صحرائے سینا کے راستے فلسطین تک لانا انسانی تاریخ کا ایسا واقعہ ہے جو آج بھی قوموں کی زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ایک چھوٹے بچے کو اس کے والدین سے الگ کر کے کنویں میں ڈال دینے پر جو تکلیف اس تین سالہ ننھی بچی کو ہوئی اس کی پھانس آج بھی چبھتی ہوئی لگتی ہے۔ انصاف کے لیے آواز اٹھانا اور دائیں بائیں دیکھے بغیر حق کا ساتھ دینا میں نے امی سے سیکھا۔ سماجی ناانصافی اور تفریق کے رویوں پر ہمیشہ تکلیف بلکہ اذیت محسوس کی۔

س: بچپن کی کوئی خاص بات؟

ج: دیواروں اور چھتوں پر چڑھنے کا شوق رہا۔ شرارتیں بھی کیں مگر بہت زیادہ نہیں۔ پڑھنے کا شوق تھا کتابی کیڑا سمجھی جاتی تھی، مذاق بھی بہت اڑتا تھا، اب بھی اڑتا ہے۔ یہ افسوس بھی دامن گیر رہا کہ دوسری بہنوں کی طرح میک اپ کرنا نہیں آتا، فیشن سینس نہیں ہے۔ ان چیزوں کے لیے والدہ کو مورد الزام ٹھہراتی رہی۔ لیکن آج سوچتی ہوں کہ والدہ نے جو تحفے دیے ان میں سب سے بڑا حصول علم کا شوق تھا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب اپنے آپ کو دنیا کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ پھر تھک ہار کر چھوڑ دیا۔

آنکھ اس دور میں کھولی تھی جب حصول علم کے ذرائع آج کی طرح میسر نہیں تھے۔ بہت سے سوالات دل میں پیدا ہوتے تھے جن کے جواب نہیں ملتے تھے، بہت تشنگی محسوس ہوتی تھی۔ بچپن میں ایک سوال بار بار دل میں پیدا ہوتا تھا کہ یہودی قوم جو یورپ کے گھیٹوز میں رہتی تھی اسے آج دنیا پر غلبہ کیسے حاصل ہے؟ انہوں نے کیسے طاقت حاصل کی؟ اسی طرح علوم کی دنیا میں مسلمانوں کے کارنامے پڑھتی تو یہ خیال پیدا ہوتا کہ ہم کب تک قرون وسطیٰ کے کارناموں پر فخر کرتے رہیں گے، یہ کب سوچیں گے کہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ کیا تھا اور ایسی کونسی غلطیاں ہیں جن کی وجہ سے آج ہم اس پستی اور ذلت کا شکار کیوں ہو گئے ہیں کہ:

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے

مجھے آج بھی بچپن کا وہ دور یاد ہے جب شعوری طور پر ''رب زدنی علما'' کو اپنی دعاؤں میں شامل کیا اور سچی بات ہے حضرت زکریاؑ کے الفاظ میں کہوں تو پروردگار نے دعاؤں کے جواب میں کبھی مایوس نہیں کیا۔ انٹرنیٹ کی آمد کے بعد پروردگار کا شکر لب پر جاری رہتا ہے کہ یہ دور نصیب کیا جب جس موضوع پر تجسس ہو معلومات چند کلکس کے فاصلے پر موجود ہوتی ہیں۔ شمالی امریکا منتقل ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہاں کی

لائبریریز سے استفادہ محسوس ہوتا ہے۔ یہ یہاں کی سب سے قیمتی سوغات ہے۔ ابن سینا یاد آتے ہیں جنہوں نے طبیب کے طور پر اپنی خدمات کے معاوضے کے بجائے شاہی لائبریری سے استفادے کو ترجیح دی۔

س: انجینئرنگ، بزنس اور ٹیلی کمیونیکیشن کے بعد اچانک صحافت کیسے؟

ج: حسن کی ملازمت (اور اس سے زیادہ میرے شوق) کے باعث ہم شمالی سعودی عرب کے ساحلی شہر ضبا منتقل ہو گئے۔ مجھے یہ بات بہت پسند ہے کہ یہ علاقہ قرآن میں مذکور مدین کا حصہ تھا جہاں حضرت موسیٰؑ نے مصر سے ہجرت کے بعد سکونت اختیار کی۔ قریہ شعیب کے نام سے ایک بستی میری رہائش سے کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر شمال میں موجود ہے۔ یہاں مجھے مشرقی اور مغربی ماخذین دونوں سے خطے کی تاریخ تفصیل سے پڑھنے کا موقعہ ملا۔ اس سے قبل شوق کے باوجود بزنس اور ٹیکنالوجی نے کبھی تاریخ کی سنجیدہ تعلیم کے قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اب تاریخ کے گہوارے میں بیٹھ کر اس کے مطالعہ نے مجھے اندر سے تبدیل کر دیا۔ وہیں پہلی دفعہ سنجیدگی سے لکھنے کا آغاز کیا۔ عرب نیوز کے ایک اردو میگزین میں تاریخ اور سیاحت پر فیچر لکھنے سے فری لانسنگ شروع کی۔ مضامین چھپنا شروع ہوئے تو ایسا لگا کہ زندگی میں شاید کوئی کام اتنا اچھا نہیں لگا جتنا لکھنا اور لکھنے کے لیے تحقیق کرنا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی شدت سے محسوس ہوئی کہ اس میدان میں سیکھنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت بچے اتنے چھوٹے تھے کہ صحافت کے لیے نئے سرے سے تعلیم تو ناممکن سی بات لگتی تھی۔ پھر اتنا مشکل سے کمایا ہوا ٹیکنالوجی کیریئر چھوڑنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ میں آئی بی اے سے چھٹی لے کر گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب افغانستان اور عراق بری طرح تباہ ہو چکے تھے۔ مزید تباہی عرب بہار کی صورت میں جمہوریت کی بقا کے نام پر مغرب اپنی مرضی کے ممالک میں برپا کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس بھی ہوتا تھا کہ آج کے دور میں تحریری جہاد کی بہت ضرورت ہے۔ مطالعہ کے دوران بعض موضوعات پر اپنے ذاتی خیالات شیئر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی۔ اقبال کا شعر یاد آتا:

دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

سماجی معاملات اور عالمی سیاست کے حوالے سے دل میں ہمیشہ سے اضطراب تھا، مضبوط رائے ہوتی تھی مگر اظہار کی طاقت مفقود تھی۔ اپنا مدعا صفحہ قرطاس پر لانے کی اہلیت بہت کم تھی۔ ان چار سالوں کے دوران جب کعبہ کے قریب جانے کا موقع ملا اس کا پردہ پکڑ کر یہ دعا ضرور کی کہ اللہ جو کچھ دل میں ہے، اس کے مؤثر اظہار کا سلیقہ دے دے اور اگر کوئی صلاحیت دی ہے تو اسے امت کی بھلائی کے لیے استعمال کروا لے۔

کینیڈا منتقلی کے بعد مجھے پہلے ہی سال ایک عالمی آن لائن اخبار میں لکھنے کا موقع ملا جسے برطانیہ کے کچھ جرنلزم طلبہ کامیابی سے چلا رہے تھے اور پوری دنیا میں ان کا نیٹ ورک تھا۔ میرا رضا کارانہ تقرر مشرق وسطیٰ کے حوالے سے تھا مگر الیکٹرانک نیوز روم میں دنیا کے جس خطے کے بارے میں ایڈیٹر اسٹوری آئیڈیا ڈالتے، اسے میں جھپٹ لیتی۔ اگلے تین مہینے میں میں نے پانچوں براعظموں کے بارے میں کوئی 80 نیوز اسٹوریز اور فیچر لکھے۔ ہر اسٹوری کے لیے متعلقہ موضوع پر ریسرچ کرنی ہوتی۔ اسی دوران شام اور عراق میں داعش اور انتہا پسند گروپوں کے پھیلاؤ، شامی مہاجرین، مصر میں اخوان پر مظالم، فلسطین، عرب بہار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال، افغانستان میں نیٹو آپریشن کے خاتمے، چارلی ہیڈو، آرمی پبلک اسکول پر حملے پر اور بیشمار دوسرے موضوعات پر لکھنے کا موقع ملا۔ مجھے اعتراف ہے کہ محنتی ہونے کے باوجود میں اس وقت صحافتی اخلاقیات کے بارے میں کم جانتی تھی۔ سیکھنے کی خواہش فطری تھی۔ سیکھنے کا یہ سفر آج تک جاری ہے اور آخری سانس تک جاری رہے گا۔ اصل میں تو یہ اللہ کی پلاننگ تھی۔ اسی نے راستے دکھائے اور ہارورڈ تک پہنچا دیا۔

س: اپنی صحافتی زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ بتائیں؟

ج: شاید سب سے زیادہ دلچسپ مرحلہ ایغور قوم پر چینی مظالم کو کور کرنے کی کہانی ہے جو آج تک جاری ہے۔ والدین کی دعاؤں کے علاوہ

میری اس کامیابی میں ایغور بھائی بہنوں کی دعاؤں نے بھی یقیناً حصہ ڈالا ہے جو اپنے ساتھ ہونے والے ظلم پر امت مسلمہ کی بے حسی پر بہت تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ میں نے ستمبر 2018ء میں اس موضوع پر ریسرچ شروع کی تھی۔ میرے والد ٹانگ کے آپریشن کے باعث یونیورسٹی آف البرٹا ہسپتال میں قریب ایک مہینہ ایڈمٹ رہے میں ان کے ساتھ تھی۔ مجھے یاد ہے میں تیمارداروں کے مخصوص کمرے میں کلاسز اور ٹیچرز کے ساتھ آن لائن میٹنگز اٹینڈ کرتی، رات کے وقت میں ہاسپٹل کے لاؤنج میں اپنے اسائنمنٹس کرتی، ایک فیس بک لائیو سیشن بھی ہاسپٹل کے ایک خالی ہال میں رات کے وقت کیا۔ وہیں ایغور بھائیوں پر چینی مظالم کے بارے میں پہلا مضمون تحریر کیا۔ کچھ لوگوں نے کہا یہ پاکستان میں چھپے گا نہیں۔ یہاں چین کے بارے میں سنسر بہت سخت ہے لیکن ایکسپریس کے سینئر ایڈیٹر عبیداللہ عابد بھائی کا شکریہ کہ انہوں نے چھاپ دیا۔ میں اس سے قبل کشمیر، فلسطین، روہنگیا، اور شام کے مسلمانوں پر بھی لکھتی رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ دیگر موضوعات پر مسلم دنیا میں لکھنے والے بہت ہیں۔ ایغور معاملے پر سنسر کی وجہ سے معلومات کی کمی ہے، اور بوجوہ مصنفین لکھنا نہیں چاہتے۔

ریسرچ رائٹنگ کے کورس کے فائنل پروجیکٹ میں میں نے ایغور مسئلے پر پروپوزل جمع کروایا تو ٹیچر راضی نہیں تھا کہ جب آپ وہاں موجود نہیں، جا نہیں سکتیں تو کیسے تحقیق کریں گی؟ میں نے صورتحال بتائی کہ جو لوگ وہاں جا بھی سکتے ہیں وہ بھی آزادانہ ایغور اور ترک نسل کے لوگوں سے بات نہیں کر سکتے۔ محض سرکاری دورہ کر کے ہی واپس آ جاتے ہیں۔ پروپوزل منظور کروانے کے لیے میں نے ٹیچر سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ کم نمبر بھی دینا چاہے تو مجھے منظور ہے لیکن میں اپنی دلچسپی کے موضوع پر ہی کام کرنا چاہتی ہوں۔ ٹیچر نے اجازت تو دے دی مگر مجھے اس کورس میں بے انتہا ریسرچ کے بعد بھی ''بی'' گریڈ ملا، جس کا کوئی افسوس نہیں۔ اس کے علاوہ کینیڈا اور بیرون ملک مقیم جن ایغور بھائی بہنوں، اور ایغور خواتین کے پاکستانی شوہروں سے انٹرویو کا موقع ملا انھیں ریسرچ پیپر میں شامل کرنے کی اجازت انھیں لاحق خطرات کی وجہ سے ہارورڈ کے ریسرچ بورڈ نے نہیں دی۔

کورس ختم ہونے کے دوران ہی بہت سے ایغور بھائی بہنوں سے میرا رابطہ ہو چکا تھا۔ اس سے اگلا مرحلہ فائنل کیپ اسٹون پروجیکٹ کا پروپوزل جمع کروانے کا تھا۔ میں نے ایغور نسل کشی کے حوالے سے پروپوزل جمع کروایا جو منظور ہو گیا۔ اس کورس میں مجھے براہ راست انٹرویو شدہ ڈیٹا ہی استعمال کرنا تھا۔ اسی رات امریکا میں مقیم ایک ایغور طالبہ سے بات ہوئی جس کے والد اور بھائی چینی کنسنٹریشن کیمپ جسے حکومت اصلاحی کیمپ کہتی ہے میں قید تھے۔ اس نے مشورہ دیا کہ اگر آپ تحقیق کے لیے سنجیدہ ہیں تو ترکی چلی جائیں وہاں بہت بڑی تعداد میں چینی مظالم سے بھاگے ہوئے ایغور پناہ گزین موجود ہیں۔ بس اسی رات میں نے سیٹ بک کروالی۔ اگلا مرحلہ ترکی میں ایغور گھرانوں سے رابطہ تھا۔ ترجمان القرآن کے نائب ایڈیٹر سلیم منصور خالد بھائی اور غفار عزیز بھائی کو اللہ بہت خوش رکھے، ان کے تعاون سے استنبول میں موجود ایغور قیادت سے پہلے ہی رابطہ ہو چکا تھا۔ الحمدللہ سارے مرحلے اللہ نے آسان کر دیے۔ یہاں تک کہ وہاں مترجمین کا انتظام بھی اللہ کرواتا رہا۔ استنبول کے دو علاقوں زیتین برنو اور سفا کوئی کے علاوہ مرکزی ترکی کے شہر قیصری میں بھی انٹرویوز کا موقع ملا۔

ایک دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ استنبول میں ایک افطار کی دعوت کے دوران ایک ایغور خاتون کو مجھ پر چینی جاسوس ہونے کا شک ہو گیا۔ وہاں موجود سب لوگ ایک دوسرے سے ایغور زبان میں بات چیت کر رہے تھے لیکن میں سمجھ گئی کہ گفتگو کا موضوع میں ہوں۔ مجھے دعوت میں لے جانے والی قازقستان سے تعلق رکھنے والی خاتون گلبہار جیلی لووا تھیں جنہوں نے خود بھی پندرہ مہینے چینی کیمپ کی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ اسی صبح ان کا انٹرویو کیا تھا۔ انٹرویو کے بعد مترجم نے مجھے بتایا کہ یہ آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں تاکہ مزید ایغور لوگوں سے آپکو ملوائیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا اور کوئی مترجم نہیں ہو گا۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں. اللہ انتظام کرے گا۔ افطار کے دوران جن خاتون سے میری گفتگو ٹوٹی پھوٹی انگلش میں ہوئی، وہ خود بڑی دکھی خاتون

تھیں۔انہیں ایک مرحلے پر یہ اشکال ہو گیا کہ میں پاکستانی ہوں اور پاکستان اور چین کی بہت دوستی ہے تو خدانخواستہ ایسا تو نہیں کہ میں چینی جاسوس ہوں اور ان سے معلومات اکٹھی کرنے کے لیے بھیجی گئی ہوں۔ چینی جاسوسی نیٹ ورک پوری دنیا میں بہت فعال ہے اور ایغور لوگ اس سے اس لیے ڈرتے ہیں کہ خدانخواستہ سنکیانگ میں مقیم ان کے خاندانوں پر مزید آفت نہ آجائے۔میرے لیے فوری طور پر صورت حال بہت عجیب ہوگئی۔ان خاتون نے مجھ سے سوال جواب کرنے کے بجائے فوری طور پر ہالینڈ میں مقیم ان ایغور بھائی سے بات کی جنہوں نے گلبہار سے میرا رابطہ کروایا تھا۔کافی دیر تک ان کے یقین دلوانے کے باوجود خاتون مطمئن نہیں ہو پا رہی تھیں۔وہ سنکیانگ میں رہ جانے والی اپنی بچی کے لیے بہت تشویش زدہ تھیں جس سے ان کا رابطہ دو سال سے ختم ہو گیا تھا۔لیکن آخر میں انہوں نے اور دیگر تمام افراد نے مجھ سے معذرت کی۔تو ایک صحافی کو معلومات اکٹھی کرنے کے لیے بسا اوقات ایسے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایسا ہی ایک واقعہ مرکزی ترکی کے قیصری نام کے شہر میں ہوا۔یہاں ترک حکومت نے تھائی لینڈ میں قید ایغور بھائیوں کی فیملیز کو ریڈ کراس کی مدد سے آزاد کروا کر بسا رکھا ہے۔وہاں میری میزبان ایک ایسی چھبیس سالہ خاتون تھیں جن کا تیسرا بیٹا تھائی لینڈ کی جیل میں پیدا ہوا۔ان کے شوہر سینکڑوں ایغور بھائیوں کی طرح اب بھی غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کے جرم میں تھائی لینڈ میں قید تھے جو انہوں نے چینی مظالم سے بچنے اور اپنی اگلی نسلوں کو الحاد سے بچانے کے لیے کی۔اس کمپلیکس میں بڑی تعداد میں بچیاں اور عورتیں مقیم تھیں۔اسی کمپلیکس کے ایک اپارٹمنٹ میں ایک صاحب نے مجھے کہا کہ ''اگر آپ ہم سے معلومات اکٹھی کر رہی ہیں تو آپ کے پاس ترک حکومت کا اجازت نامہ ہونا چاہیے۔اس سے قبل یہاں ایک الجزیرہ کی صحافی بھی آئی تھیں لیکن ہم نے انہیں معلومات اکٹھا نہیں کرنے دی''۔ مجھے معلوم تھا میں کوئی غیر قانونی کام نہیں کر رہی تھی۔لیکن صورتحال یہ تھی کہ دو دن پیشتر میں عفسوس کے کھنڈرات کے قریب سلجوق نامی شہر میں اپنا پرس کھو چکی تھی جس میں کیش کریڈٹ کارڈ اور پاسپورٹ چلا گیا تھا۔اور میرے پاس فی الوقت کوئی شناختی دستاویز نہیں تھی۔دیارِ غیر میں میرے لیے کوئی چھوٹی سی پیچیدگی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی خصوصاً اس صورت میں کہ اس شہر میں دور دور تک کوئی پاکستانی موجود نہیں تھا۔میں نے فوری طور پر مترجم کے ذریعے اپنی میزبان سے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو میں اسی وقت یہاں سے نکل جاؤں۔بس اسٹاپ قریب ہی تھا لیکن کسی پیچیدگی کی صورت میں رات زیادہ ہونے پر میرا وہاں سے نکلنا ناممکن ہو جاتا۔مترجم نے مجھے یقین دلایا کہ آپ یہاں محفوظ ہیں۔اس کے باوجود کہ وہ میرے بارے میں شک کا شکار رہے، البتہ میرے میزبانوں نے مجھے انتہائی محبت سے مجھے رکھا۔ایک بچی کی محبت مجھے نہیں بھولتی جس نے مجھے میرے کپڑے نہیں دھونے دیے، نہ ہی استری کرنے دیے۔وہیں ناشتے پر میری ملاقات ایسی کچھ بہنوں سے ہوئی جن کے والدین انھیں ترکی چھوڑ گئے تھے۔میرے استفسار پر کہ نوعمر بچیوں کو والدین کیوں چھوڑ گئے ان کا کہنا تھا ''تاکہ ہم دین کا علم حاصل کر سکیں اور ہماری آئندہ نسلیں مسلمان رہ سکیں''۔چین کے زیرِ انتظام مقبوضہ مشرقی ترکستان (سنکیانگ) میں ایسا ممکن نہیں، اس لیے والدین نوعمر بچیوں تک کی جدائی برداشت کر لیتے ہیں۔ہم پاکستان اور دنیا کے دوسرے حصوں میں مذہب پر عمل کی آزادی کو for granted لیتے ہیں شاید اس لیے ان کی تکلیف کا ادراک نہیں کر سکتے۔

س: گھر، بچوں، پڑھائی اور صحافت میں توازن کیسے ممکن ہوا؟ بڑے ہوتے ہوئے بچوں کے ساتھ خود پڑھنے کا تجربہ کیسا لگا؟

ج: جہاں تک توازن کی بات ہے تو میں نے تین ترجیحات واضح کر لی تھیں: والدین، شوہر اور بچے، اور پڑھائی۔اس عرصے میں میں نے سوشل لائف کو اور شاپنگ وغیرہ کو انتہائی ضروری کی حد تک محدود کر لیا تھا بلکہ گھر سے بھی صرف ضرورت کے تحت نکلتی تھی۔میری والدہ اس دوران کئی مرتبہ ہسپتال میں داخل رہیں۔ایسا بھی ہوا میں ان کے قریب بیٹھ کر پوری رات کمپیوٹر پر کام کرتی رہتی۔وہ تکلیف میں ہوتیں میں وقفے وقفے سے گرم پانی کی بوتل دیتی یا تیل کی مالش کرتی تو انھیں آرام آجاتا اور وہ سو

جاتیں۔تکلیف کے باوجود میرے مضامین سن کر بہت خوش ہوتیں۔ان کی دعائیں اس سفر میں بہت قیمتی رہیں۔

میں نے سعودی عرب میں قیام کے دوران اپنے بچوں کو ہوم اسکولنگ کروائی تھی۔یہ وقت جو بچوں کو دیا، یہ دو طرح سے ہارورڈ کی تعلیم کے دوران میرے بہت کام آیا۔ایک تو یہ کہ کینیڈا آ کر جب بچوں نے اسکول جوائن کیا تو وہ اپنی تعلیم اور ذاتی ضرورتوں کے حوالے سے خود کفیل تھے۔دوسرے یہ کہ ہوم اسکولنگ کی تعلیم زیادہ تر کچن یا گھر کے دوسرے کاموں کے دوران ہوتی تو اس کا ایک فائدہ یہ ہؤا کہ بچے بہت جلد کوکنگ سیکھ گئے۔میں نے دس سال کی عمر تک چولہا جلانے پر پابندی لگائی تھی لیکن دیگر کاموں میں میں نے شروع سے ان کی مدد لی۔جس وقت میں پہلا سمسٹر پڑھنے امریکا گئی، الحمدللہ بڑی بیٹی جونیئر ہائی اسکول میں تھی۔میری تقریباً روز بات ہوتی، لیکن مجھ سے کبھی یہ نہیں پوچھا گیا کہ فلاں چیز کہاں رکھی ہے یا گھر کا فلاں مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔یہاں حسن کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ویسے تو انہوں نے ہمیشہ روایتی جنوبی ایشیا کے مرد بننے کی ایکٹنگ کی لیکن میرے ماسٹرز کے دوران خاموشی سے ہر ممکن تعاون کیا۔

س:امت مسلمہ کے مستقبل کو کیسا دیکھتی ہیں؟

ج:ہمارا دنیا کو دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم بہت معصوم اور اچھے ہیں۔اس لیے ساری دنیا ہمارے خلاف سازشیں کرتی ہے۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر قوم دوسرے سے طاقت چھیننے کی کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب صرف وہ ہوتے ہیں جن کی کوششوں کے پیچھے تحقیق اور طویل المدت پلاننگ ہوتی ہے۔دنیا جذباتی باتوں سے نہیں چلتی کہ فلاں ہمارا دوست ہے، اس لیے اس کی ہر بات اچھی ہے۔امریکا، روس، چین، اسرائیل کبھی ہمارے دوست نہیں ہو سکتے لیکن صرف ان کو برا بھلا کہہ کر ہم کیا حاصل کر رہے ہیں؟ مجھے تو بہت سوچ بچار کے بعد یہ بات سمجھ آئی ہے کہ جس چیز کو ہم یہودی اور مغربی سازش کہتے ہیں یہ در اصل ان کے ہاں تحقیق کی مضبوط روایت ہے۔یہی راستہ چین اور چند دیگر ایشیائی ملکوں نے اپنایا۔یہی ہماری بھی بقا کا راستہ ہے جسے ہم اپنانے سے گریزاں ہیں۔اس کی بات کی جائے تو ہمارے لوگ کہتے ہیں کہ یہ حکومت کا کام ہے۔میرا ماننا یہ ہے کہ حکومت تک بات پہنچنے سے پہلے کسی بھی قوم کی intelligentsia یعنی دانشور طبقے کو اس چیز کا شعور ہونا چاہیے، جو اس کی اہمیت کو عوام میں منتقل کرتے ہیں۔میری رائے میں اصل تبدیلی حکومت سے نہیں ذہنوں کو تبدیل کرنے سے شروع ہوتی ہے اور یہ دانشور طبقے کا کام ہے جس میں علمی اشرافیہ، فکشن اور نان فکشن رائیٹر، فلم میکر، ڈرامہ رائیٹر، صحافی، مذہبی علماء اور سماجی مصلحین سب شامل ہیں جو کسی بھی قوم میں تبدیلی کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس طبقے کو تحقیق کے عمل کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔

دوسرا ایک بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم دنیا سے سیکھنے کو تیار نہیں۔ہمارا خیال ہے باقی دنیا کے مقابلے میں ہم بہت عقل مند ہیں اور دنیا سے سیکھنے میں ایمان جانے کا خطرہ ہے۔اپنے عروج کے زمانے میں ہم اس احساس کمتری کا شکار نہیں تھے۔ہم نے یونانی، ایرانی، ہندوستانی، رومی، اور چینی ہر قوم سے علم کی دولت حاصل کی۔اس کے بعد مغرب نے اس وقت ترقی کی جب انہوں نے بغیر احساس کمتری کے مسلمانوں کے مرتب کردہ علمی کام سے استفادہ کیا۔کیا وہ ہمارے کام سے استفادے کے نتیجے میں مسلمان ہو گئے؟ قائداعظم اور علامہ اقبال دو مثالیں ہمارے پاس موجود ہیں جنہوں نے مغرب سے تحصیل علم کے بعد اپنے لوگوں کے لیے خلوص سے کام کیا۔لیکن ہم میں نہ مانوں پر اڑے ہوئے ہیں۔تحقیق اور دوررس پلاننگ کے بغیر ہم اپنی بقا کی طاقت حاصل نہیں کر سکتے چاہے کتنے ہی ایٹم بم بنا لیں۔اور دوررس طویل المدت پلاننگ اور تحقیق ہمیں انہی قوموں کو دیکھ کر سیکھنی ہوگی جو آج علمی دنیا کے امام ہیں۔

امت کی تنزلی کا رٹا رٹایا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ ایسا اس لیے ہے کہ قرآن پر عمل چھوڑ دیا ہے لیکن کون سا عمل ہے جو چھوڑا؟ میرا ایمان کہ قرآن کے ہر دوسرے صفحے پر تخلیق کائنات کی نشانیوں میں غور و فکر کا حکم دراصل تحقیق کی تاکید ہے جسے ہم نے اجتماعی طور پر نظر انداز کیا ہؤا ہے۔ہم ان آیات کو سنجیدگی سے لینے پر تیار نہیں، اور یہی ہماری پستی کی وجہ ہے۔

ثریا نے زمیں پر آسماں سے ہم کو دے مارا

ایک واقعہ مجھے بہت پسند ہے کہ ابن سینا ریاضی اور میڈیسن کے بعد جب فلسفے کی تعلیم پر پہنچے تو ارسطو کے فلسفے کی چند گتھیاں انھیں سمجھ نہیں آتی تھیں۔ان کی بے چینی اور تکلیف اتنی بڑھی کہ مسجد جا کر سجدے میں گر کر رو رو کر اللہ سے مدد مانگتے۔بالآخر ایک پرانی کتابوں کے اسٹال پر ارسطو کے فلسفے پر الفارابی کی لکھی ہوئی شرح نظر آئی جسے پڑھ کر ان کا اشکال دور ہوا۔سوچیں یہ عروج کے زمانے کے مسلمانوں کا رویہ تھا۔البیرونی نے علم کی تلاش میں ہندوستان کا سفر کیا، سنسکرت زبان سیکھی۔تلاس کی جنگ میں پکڑے گئے چینی قیدیوں سے کاغذ بنانا سیکھا گیا۔حضرت عمرؓ نے عراقی انجینئرز سے زمین کی پیمائش کے اصول دریافت کیے اور ان کی مہارت کی قدر کرتے ہوئے ان کی ملازمت پر برقرار رہا۔بغداد میں بلاتفریق مذہب، رنگ اور نسل علماء کو اتنا نوازا گیا کہ ساری دنیا سے اہل علم کھنچ کر بغداد میں جمع ہو گئے۔آج ہمارے لیڈران جذباتی تقریریں کر کے قوم کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا رکھتے ہیں اور قوم اپنے اپنے لیڈر کی عقیدت میں ڈوب کر ایک کلٹ (cult) بنتی جا رہی ہے۔آزادانہ سوچ کو نہ اسکول میں پروان چڑھایا جاتا ہے نہ مدرسے میں۔

ایک اور جملہ تواتر کے ساتھ بولا جاتا ہے کہ ''فرض صرف دین کا علم ہوتا ہے''۔ہمیں اس جملے نے تباہ کر دیا۔یہ جملہ بولتے ہوئے دین کا جو تصور ہوتا ہے وہ چند ظاہری اعمال تک محدود ہوتا ہے، جبکہ دین پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔یہ جملہ بولنے والے دراصل خود دین اور دنیا کو الگ الگ چیز سمجھتے ہیں۔سید مودودی، یوسف قرضاوی نے اس نظریے پر ضرب لگانے کی کوشش کی لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلم دنیا جن طبقات کے نرغے میں ہے وہ اس چیز کو سمجھنے پر تیار نہیں۔کیا دفاع کے لیے طاقت پکڑنے کی کوشش دین کا حصہ نہیں؟ روایتی ہتھیاروں کے علاوہ، آج کی دنیا کے اصل ہتھیار علم اور تحقیق ہیں۔کوئی قوم ان کے بغیر اپنا دفاع نہیں کر سکتی۔یہ بات ہمیں سمجھنا ہو گی۔ایسے لیڈران جو تحقیق کی ضرورت کا ویژن نہیں رکھتے، اپنے متبعین کو اس کے شعور سے دور رکھنے کا باعث ہوتے ہیں، وہ امت کی زبوں حالی کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں۔میرا ماننا ہے کہ دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے دنیا کو سمجھنا لازمی ہے اور دنیا کو سمجھنے کے لیے تحقیق لازمی ہے۔یہی بات سید مودودیؒ نے کہی کہ ہم دنیا کے امام بننے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے جب تک علم اور تحقیق کے امام نہ بن جائیں۔

س: آپ سے بات چیت کر کے بہت اچھا لگا۔

ج: ماہنامہ بتول کی ذاتی طور پر شکر گزار ہوں کہ اس موقع پر مجھے اظہار خیال اور زندگی کے چیدہ چیدہ گوشے شیئر کرنے کی دعوت دی۔مجھ سے سماجی موضوعات پر لکھوانے کا سہرا بتول کی ایڈیٹر صائمہ اسما کو جاتا ہے۔بتول جیسے معیاری جریدے کے لیے لکھنا ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے۔اس رسالے کا قاری ہمیشہ دل کے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔نظریاتی یکسانیت کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔میں سمجھتی ہوں یہ رسالہ سماج بلکہ دنیا میں تبدیلی کا ایجنٹ ہے۔ایک بات خاص طور پر کرنا چاہوں گی کہ بتول کے لیے لکھنا شروع کیا تو محسوس ہوتا تھا کہ کچھ نازک موضوعات پر میں اپنی بات جتنی صاف گوئی سے کہہ جاتی ہوں وہ بتول کے ادارتی بورڈ کے لیے شاید قابل قبول نہ ہو لیکن یہاں مجھے ہمیشہ اپنی بات کہنے کی آزادی ملی جو شاید میرے جیسے لکھاری کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے اور جس کے لیے میں اس رسالے کی معترف ہوں۔

آپ کا بہت شکریہ، سلامت رہیں۔

☆.....☆.....☆

یادداشتیں
دوسرا اور آخری حصہ

پروفیسر خواجہ مسعود

سعودی عرب میں ایک سال

اب آیئے چلتے ہیں خُبر سے حرمین شریف کے سفر پر۔خُبر میں قیام کے دوران ہم کئی دفعہ حرمین شریفین کے سفر پر گئے۔ ہر مہینے میں ایک بار تو ضرور چلے جایا کرتے تھے۔کبھی تو بیٹے کے ساتھ ان کی گاڑی میں یہ سفر مبارک کرتے تھے اور کبھی وہاں سے بذریعہ کوچ جایا کرتے تھے۔

خُبر سے حرمین شریفین کا سفر قریباً بارہ سو کلومیٹر تھا۔خُبر سے کوچز کا پیکیج ہوا کرتا تھا۔تین چار دن کا پیکیج قریباً سو، سوا سو ریال فی کس کے حساب سے ہوتا جس میں خُبر سے مکہ معظّمہ کا سفر وہاں عمرہ کی ادائیگی، پھر وہاں سے مدینہ منورہ کا سفر اور زیارات۔

یہ کوچز عموماً رات کو ہی سفر کرتی تھیں۔ دن کے وقت عمرہ اور مدینہ میں مسجد نبوی میں قیام، نمازوں کی ادائیگی اگر سونا ہے تو کوچ میں ہی سو جائیں۔ہوٹل کا قیام اس پیکیج میں شامل نہیں ہوتا تھا۔کوچز شام کو چار یا پانچ بجے خُبر سے روانہ ہو جاتی تھیں۔عموماً یہ ایرکنڈیشنڈ ہوتی ہیں اس لیے سفر خوشگوار ہے حالانکہ باہر سخت گرمی ہوتی ہے۔یہ سفر قریباً پندرہ گھنٹے میں طے ہوتا ہے کیونکہ راستے میں کوچز تین چار دفعہ سروس سٹیشنز پر رکتی ہیں۔ کبھی نماز کے لیے۔اکثر وہ ایسے وقت رکتے ہیں کہ دو نمازیں (مغرب اور عشاء) اکٹھی ادا کر لی جائیں۔ ہر سروس سٹیشن پر مسجد ہوتی ہے، ریستوران، گاڑیوں کی ورکشاپ اور کوئی سٹور بھی۔لیکن وہاں اکثر واش رومز میں کافی رش ہو جاتا ہے۔اور دوسرے یہ دقت ہوتی ہے کہ واش رومز میں انگلش سیٹ نہیں ہوتی، زیادہ تر بیٹھنے والی سیٹ ہوتی ہے جس سے کئی بزرگوں کو بہت دقت ہوتی ہے۔ریستوران پر ہر قسم کے کھانے مل جاتے ہیں خاص طور پر عربی سٹائل کے مندی رائس مزیدار ہوتے ہیں۔اس وقت تو مرغ والے مندی رائس دس ریال کے مل جاتے تھے۔

کوچز کے ڈرائیور ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔حادثے کم ہی ہوتے تھے۔ایک دفعہ تو یوں ہوا ایک کوچ میں ہم خُبر سے مکہ معظّمہ کی طرف جا رہے تھے کہ ہمارے پوتے پوتی نے ہمیں بتایا کیونکہ وہ اگلی سیٹوں پر ڈرائیور کے قریب بیٹھے تھے، کہنے لگے ''دادا ابو انکل ڈرائیور کوچ چلاتے ہوئے سو بھی جاتے تھے اور پھر اچانک جاگ جاتے تھے کہ پانچ منٹ بعد ان کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھتی تھی غالباً یہ گھنٹی انہیں جگانے کے لیے ہی سیٹ کی گئی تھی ہم نے شکر کیا کہ بہ خیریت سے منزل پر پہنچ گئے۔

طائف کے قریب پہنچ کر میقات آتا تھا وہاں بس ایک گھنٹہ رکتی تھی اور سب اتر کر وضو وغیرہ کر کے احرام باندھ لیتے تھے۔وہاں سے پھر مکہ معظّمہ پہنچ جاتے۔

وہاں سیدھے حرم شریف پہنچتے اور عمرہ ادا کیا جاتا۔عمرہ کی ادائیگی کے بعد احرام کھولا جاتا اور ناشتے کے لیے ہوٹل کا رخ کرتے۔ ہر طرح کے ناشتے کی ورائٹی موجود ہوتی۔ سارا دن مکہ معظّمہ میں گزارا جاتا اور رات کو آٹھ یا نو بجے پھر کوچ میں بیٹھتے تو رات کا سفر طے کر کے فجر سے پہلے مدینہ منورہ پہنچ جاتے۔

مکہ سے مدینہ کا سفر کوچ قریباً چھ گھنٹوں میں طے کرتی۔وہ سارا دن مسجد نبویؐ میں گزارا جاتا نمازیں ادا کرتے روضہ رسولؐ کی خوب زیارت کرتے، ریاض الجنہ میں نوافل ادا کرتے۔سارا دن گزارنے کے بعد پھر رات کو واپسی کا سفر شروع ہو جاتا اور اگلی صبح بس خُبر پہنچ جاتی۔لیکن ہم تو اکثر پورے ایک ہفتہ کے لیے مدینہ منورہ میں رک جاتے اور اگلے ہفتہ جب وہی کوچ دوبارہ آتی تو اس میں سوار ہو کر واپس خُبر آتے۔اس طرح خوب جی بھر کے مسجد نبوی میں نمازیں پڑھتے، روضہ رسولؐ کی زیارت کرتے اور باقی مقامات کی زیارتیں بھی۔ واپس خُبر پہنچ کر خوب مزے سے سوتے اور تھکاوٹ دور کرتے اور نیند کی کمی پوری کرتے۔ یہ

بتانا رہ گیا کہ مدینہ منور میں ہم پورا ہفتہ اپنے خرچ پر ہوٹل میں ٹھہرتے تھے کیونکہ اتنے سستے پیکیج میں ہوٹل کا قیام تو شامل نہیں ہوتا تھا۔ آتے ہوئے کھجوریں اور آب زم زم ساتھ لاتے اور کئی دن تک ان کی برکات سے مستفید ہوتے رہتے۔ مدینہ منورہ ہم اتنی دفعہ جا چکے ہیں اور اتنا قیام کر چکے ہیں، حتیٰ کہ ہم نے دو عیدیں بھی وہاں گزاریں کہ یوں لگتا ہے مدینہ منورہ بھی ہمارا اپنا پیارا شہر ہے، اپنا گھر ہے۔

زیادہ تر عمرے ہم نے رمضان المبارک میں ادا کئے۔ رمضان المبارک میں بھی تو عمرے کا بے حد لطف آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مکہ معظّمہ میں اور مدینہ منورہ میں بھی رمضان میں خصوصی انوار کی بارشیں ہوتی ہیں، اللہ کی رحمتیں ہوتی ہیں۔ تراویح کی فضیلتیں اور رونقیں، قیام اللیل کے روح پرور مناظر، رات کو خانہ کعبہ میں بیٹھ کر عبادت کا بے حد لطف آتا ہے، دل و روح کو ایک عجیب فرحت محسوس ہوتی ہے اور پھر مسجد نبویؐ میں بیٹھ کر افطاری کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ان دنوں عربی شیوخ کی فیاضی عروج پر ہوتی ہے۔ حرمین شریفین میں بڑھ چڑھ کر زائرین کے لیے افطاری کا اہتمام کرتے ہیں۔ پھل، کھجوریں، مشروبات اور کھانے تقسیم کئے جاتے ہیں اور پھر آب زم زم سے افطاری کتنی بڑی سعادت ہے۔ لیکن یہ ہوتا ہے کہ رمضان المبارک کے دوران ہوٹلوں میں کمروں کے کرائے کئی گناہ بڑھ جاتے ہیں البتہ کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں نہیں بڑھائی جاتیں۔

رسول پاکؐ کا فرمان ہے کہ ''جس نے رمضان میں عمرہ ادا کیا اسے حج کا ثواب ملے گا حج بھی وہ جو میری معیت میں ادا کیا جائے''۔ رمضان المبارک میں عبادتوں کا ثواب بھی بڑھ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ایک دفعہ زندگی میں رمضان المبارک میں ضرور عمرہ کی سعادت نصیب فرمائے (آمین)۔

عمروں کے دوران ہمارے ساتھ جو خصوصی واقعات پیش آئے انہیں میں الگ اپنے مضمون ''یہ لمحے بار بار آیا نہیں کرتے'' میں قلمبند کر چکا ہوں۔ جو ''چمن بتول'' (ماہ اگست 2018) میں شائع ہو چکا ہے۔ اس لیے ان واقعات کو یہاں نہیں دہرایا گیا۔

چلیے اب کچھ ذکر دہران کا ہو جائے۔ بعد میں جب دو دفعہ پھر وزٹ ویزہ پہ سعودی عرب گئے تو بیٹے کو یونیورسٹی کے اندر ہی فلیٹ مل گیا تھا۔ اچھا فلیٹ تھا، دو بیڈ روم اور ایک ٹی وی لاؤنج۔ دہران کی وجہ شہرت ایک یہ بھی ہے کہ وہاں ایک مشہور آئل کمپنی آرامکو (عربین امریکن آئل کمپنی) کا ہیڈ آفس ہے۔ وہاں وہ کنگ فہد یونیورسٹی کے ساتھ تھا لیکن سخت سکیورٹی کے حصار میں اس کمپنی کے دفاتر اور رہائشی علاقے کے ارد گرد اونچی اونچی چار دیواری تھی کیونکہ اس کمپنی میں کافی امریکن سٹاف بھی ہے۔ پھر دہران میں امریکن ایمبسی بھی ہے وہاں بھی سخت سکیورٹی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی ایک بڑے وسیع علاقے میں تھی۔ کلاس روم، دفاتر اور ہوٹل تو تھے ہی لیکن سٹاف کے لیے اور پی ایچ ڈی طلبہ کے لیے بہترین رہائش گاہیں تھیں۔

علاقے کے اندر پارک بھی تھے کھیل کے میدان اور ڈیپارٹمنٹل سٹور بھی، دو اچھے ریستوران بھی تھے۔ یونیورسٹی کے اندر زیادہ تر پاکستانی، انڈین اور مصری سٹاف کے لوگ نظر آتے تھے۔ پاکستانی سٹاف ممبران اور پی ایچ ڈی طلبہ بھی کافی تھے۔ سبھی اپنے کنبوں کے ساتھ رہتے تھے جن میں اکثر کا آپس میں ملنا جلنا رہتا تھا۔ دعوتیں بھی ہوتی تھیں بڑا اچھا ماحول تھا پاکستانی گھرانوں کی بھی اکثر محافل ہوتی رہتی تھیں۔ عرب طلبہ کو کافی مراعات حاصل تھیں، ان کو غیر ملکی طلبہ کے مقابلے میں دگنا اسکالر شپ ملتا تھا۔ سعودی عرب میں گورنمنٹ کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم بالکل فری ہے یونیورسٹی میں ان کو سکالرشپ ملتا تھا۔

یونیورسٹی کے اندر تین بڑی بڑی مساجد تھیں کافی وسیع اور آرام دہ۔ جس مسجد میں ہم نماز پڑھنے جاتے تھے اس میں ایک کتابوں کی لائبریری بھی تھی جن میں احادیث، تفاسیر، فقہ، اور تاریخ کی کتب پڑی ہوتی تھیں۔ ان میں مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن بھی میں نے دیکھی۔ میں اکثر مسجد کی لائبریری سے پڑھنے کے لیے کتابیں لے آتا کیونکہ وہاں کئی اردو میں لکھی ہوئی کتابیں تھیں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ احباب نے جماعت اسلامی کا ایک حلقہ بھی بنا رکھا تھا اور وہ اکثر اکٹھے ہوتے تھے کبھی

کبھی ہمیں بھی شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور ہم بھی شامل ہوتے تھے۔

ایک بات ہم نے وہاں مساجد میں دیکھی جو یہاں پاکستان میں نہیں دیکھنے میں آتی۔ایک دن موسم خراب تھا بارش ہو رہی تھی۔ہم مغرب کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے۔جونہی مغرب کے تین فرض ادا کیے گئے امام صاحب نے پھر نیت باندھی۔پتہ چلا کہ عشا کی نماز بھی ابھی پڑھائی جارہی ہے تو ہم نے بھی پڑھ لی۔وہاں اکثر ایسے ہوتا۔موسم خراب ہونے کی صورت میں دو نمازیں اکٹھی پڑھ دی جاتیں۔

ان دنوں خواتین کو ڈرائیونگ کی اجازت نہیں تھی لیکن اس وقت بھی یونیورسٹی کی حدود کے اندر خواتین کار ڈرائیو کر سکتی تھیں۔دمام میں یونیورسٹی کے اندر ہم نے سبز گھاس بھی دیکھی اور درخت بھی اُگے ہوئے دیکھے لیکن ان کو روزانہ پانی دیا جاتا تھا کیونکہ گرمی کی وجہ سے پانی جلدی خشک ہو جاتا تھا۔بلکہ ہم نے دیکھا ایک مسلسل لمبی پانی کی پائپ سڑک کے دونوں طرف درختوں کے ساتھ ساتھ بچھی تھی اور اس میں ہر درخت کو آہستہ آہستہ ایک فوارے کی صورت میں پانی ملتا رہتا۔

سعودی عرب میں ہم نے کتا کبھی نہیں دیکھا لیکن بلیاں بہت زیادہ ہیں۔یونیورسٹی کے اندر کافی بلیاں تھیں۔میں دیکھتا تھا کہ ایک انگریز روزانہ اپنے گھر سے دودھ لے کے نکلتا۔وہ باہر آتا تو نہ جانے کہاں سے بے شمار بلیاں نمودار ہو جاتیں اور وہ ان کو دودھ پلاتا۔ہم جب تک وہاں رہے ہم نے اُس انگریز کو بلا ناغہ بلیوں کو دودھ ڈالتے دیکھا۔

یونیورسٹی کے اندر کئی جگہوں پہ چھوٹے چھوٹے پارک بنے ہوئے تھے، میں بچوں کو لے کر اکثر وہاں چلا جاتا۔بچے وہاں خوب کھیلتے اور انجوائے کرتے۔

ہمارے فلیٹ کے بالکل سامنے پلے گراؤنڈ تھا جس میں اکثر پاکستانی اکٹھے ہو کر رات کے وقت کرکٹ یا باسکٹ بال کھیل رہے ہوتے۔میچ کھیلے جاتے اور خوب رونق لگتی۔ویک اینڈ پہ تو آدھی آدھی رات تک گیم جاری رہتی۔باقی دنوں میں بچے وہاں جا کے کھیلتے۔کبھی فٹ بال، کبھی باسکٹ بال، کبھی کرکٹ، کبھی اپنی سائیکلیں وہاں چلاتے رہتے۔

دہران میں ایک بہت بڑا اور خوبصورت مال تھا جس کا نام تھا مال آف دہران اس میں بڑے بڑے سٹور بھی تھے اور ہر برانڈ کی دکانیں تھیں اکثر پہ 70 فیصد ڈسکاؤنٹ لکھا ہوتا لیکن ہم نے دیکھا کہ ستر فیصد رعایت کے بعد بھی وہ چیز عام مارکیٹ کی نسبت مہنگی ہوتی تھی۔مال آف دہران ایک مہنگا ترین مال تھا جس میں سعودی امراء اور ان کی بیگمات شاپنگ کے لیے آتیں۔وہاں فوڈ کورٹ بھی تھی اور بچوں کے لیے پلے لینڈ بھی۔

سعودی عرب میں ایک بڑا مسئلہ ہوتا تھا۔شرطوں (پولیس) کا خوف بہت ہوتا تھا وہ کسی وقت بھی کسی جگہ بھی روک کر پاسپورٹ یا اقامہ چیک کر سکتے تھے اور اگر آپ پاسپورٹ گھر بھول آئیں تو مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔اس لیے ہم باقاعدگی سے پاسپورٹ ویزہ پاس رکھتے تھے۔

یونیورسٹی کے مَیس سے اکثر ہم ایک عربی سویٹ ڈش منگوایا کرتے جو عربوں کی بہت پسندیدہ ہے۔اس کا نام ''ام علی'' ہے۔مزیدار ہوتی تھی۔اب کے ہمیں دہران میں چھ ماہ رکنا پڑا۔کیونکہ بیٹے اور بہو کا حج کا پروگرام بن گیا اور ہمیں بچوں کے پاس ٹھہرنا تھا۔

بیٹا اور بہو اپنی گاڑی میں حج پر چلے گئے اور ہم بچوں کے پاس رہے۔وہاں بلڈنگ میں اتنا اچھا ماحول تھا کہ پورا ایک ہفتہ ہمیں پاکستانی گھرانوں نے کھانا نہیں پکانے دیا اور قسم قسم کے کھانے بنا کے ہمیں روز بھیجتے تھے۔ہم نے ان کی مہمان نوازی سے خوب لطف اٹھایا۔بیٹا اور بہو حج کر کے واپس آ گئے۔پھر جوں ہی حج کا موسم ختم ہونے کو تھا میں اور اہلیہ کوچ کے ذریعہ عمرہ کے لیے پہنچ گئے۔اس وقت حرم میں رش بے حد کم تھا کیونکہ بیرونی ممالک سے بھی عمرے کے ویزے شروع نہیں ہوئے تھے۔ہم نے بڑی آسانی سے طواف کعبہ کیا حجرِ اسود کے خوب بوسے لیے سعی بھی آسانی سے ہو گئی۔روزانہ طواف کعبہ کرتے، رات کو خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر نوافل ادا کرتے تلاوت کلام پاک کرتے، کبھی بیٹھے ہوئے خانہ کعبہ کو دیکھتے رہتے اور نور کی تجلیوں سے روح کو گرماتے رہے۔

پھر مدینہ منورہ پہنچے وہاں بھی رش کم تھا۔مدینہ میں ہم اکثر بنگالی محلّہ میں ''قصر العبودی'' نامی ہوٹل میں میں قیام کرتے۔یہ ایک صاف

ستھرا ہوٹل ہے ۔ رمضان میں جس کمرے کا کرایہ وہ ایک ہزار ریال وصول کرتے عام دنوں میں ہم سے ایک سو ریال کمرے کا وصول کرتے ۔ وہاں بے شمار بنگالی اور پاکستانی ہوٹل ہیں تو ناشتے اور کھانے پینے کا بھی آرام تھا۔مسجد نبویؐ میں بہت خوشگوار لمحات گزار کر ہماری واپسی ہوئی ۔

اب کچھ ذکر دمام کا بھی ہو جائے ۔ وہاں بھی ہم اکثر چلے جاتے تھے کیونکہ دہران سے صرف آدھے گھنٹے کی مسافت پر یہ شہر ہے ۔ یہاں انٹرنیشنل ایرپورٹ ہے اور یہ سعودی عرب کا ایک بہت بڑا اور صنعتی شہر اور بڑا کاروباری مرکز بھی ہے ۔ وہاں ایسے بڑے بڑے سٹور بھی تھے جہاں لکھا ہوتا کل شئی ریال (ہر شے ایک ریال میں) کل شئی ریالین (ہر شے دو دو ریال کی) یا کل شئِ عشرہ ریال (ہر شے دس ریال کی) وہاں بچے بڑے سب دل کھول کر شاپنگ کرتے لدے پھدے واپس گھر آتے ۔

دمام میں ہم نے ایک سڑک دیکھی جس پہ گاڑیوں کی ورکشاپس تھیں اور وہ نوے فیصد پاکستانی مکینکوں کی تھیں ۔ دمام سے آگے جائیں تو جبیل نامی ایک شہر آتا ہے جو ساحل سمندر پہ واقع ہے وہاں بھی جانے کا اتفاق ہؤا اچھا خوبصورت ساحل ہے ، کچھ ریستوران اور کچھ دکانیں ہیں ۔ وہاں سمندر کی سیر بھی کی ، سمندر میں نہائے بھی اور بچوں نے خوب مزے کئے ۔

پھر ایک اور مشہور ساحل ہے جس کا نام '' راس التنورہ'' ہے وہاں بھی جانے کا اتفاق ہؤا ۔ یہ اور بھی خوبصورت بیچ ہے اکثر لوگ وہاں سیر کرنے جاتے ہیں ۔

صحرائی علاقوں سے گزرتے ہوئے اکثر اونٹ نظر آتے ۔ وہاں ہم نے کئی رنگ اور کئی قسم کے اونٹ دیکھے ۔ صحراؤں میں ابھی بھی خیمہ بستیاں بسائی جاتی ہیں اور چھٹی کے دن عرب لوگ تفریح کے لیے ان صحراؤں میں جاتے ہیں خیموں کے اندر دن بسر کرتے ہیں اور اپنے پرانے کلچر کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔

سعودی عرب میں گزرے ہمارے یہ دن یادگار تھے ، ہم انہیں آج تک نہیں بھلا سکے ۔ خاص طور پہ حرمین شریفین کے سفر ، عمرے کی سعادتیں ، مسجد نبوی کی بہاریں سبھی کچھ تو یاد آتا ہے ۔ یہ دن ہماری زندگی کا سرمایہ ہیں ۔ اس دعا کے ساتھ مضمون کا اختتام کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب بہن بھائیوں کو عمرے کی سعادتیں ، حج کی سعادتیں نصیب فرمائے اور گنبد خضریٰ کے نظارے نصیب فرمائے (آمین) ۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر ممتاز عمر

میری ماں جی

میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ان کا یہی معمول دیکھا کہ صبح سویرے اٹھتیں نماز کی ادائیگی کے بعد قرآن کریم کی تلاوت کرتیں اور ترجمہ بھی اٹک اٹک کر پڑھتیں جس کے بعد وہ ہمارے لیے ناشتہ تیار کرتیں۔ مگر جب سب بہن بھائی شادیوں سے فارغ ہوئے تو ان کے معمولات میں یہ تغیر رونما ہوا کہ تلاوت کے بعد آنے والے اخبارات ورسائل کا مطالعہ کرتیں۔ جب بچے ناشتہ کر رہے ہوتے تو وہ محض ایک کپ چائے پی کر خود کو مطالعہ میں مصروف رکھتیں۔ جب سب بچے اسکول چلے جاتے تو پہلے والد صاحب کو ناشتہ کراتیں اور پھر خود بھی کرتیں۔

سب بہن بھائیوں کی شادی کے بعد ان کی گھریلو ذمہ داریاں تقریباً ختم ہو چکی تھیں اس لیے تحریک اسلامی سے ان کا اٹوٹ رشتہ مزید مضبوط ہو گیا۔ وہ دن کے اوقات میں محلے کے گھروں میں جا کر دروس قرآن کی محافل کے لیے دعوت دیتیں اور کم وبیش ہر روز یا دوسرے روز کہیں نہ کہیں درس قرآن کی محفل سجایا کرتیں۔ اپنے گھر میں نمازِ جمعہ کے بعد اجتماع اہل خانہ کا اہتمام ان کا معمول تھا۔ گھر کے چھوٹے بڑے سب ہی جمع ہو جاتے۔ پھر کچھ مطالعہ کیا جاتا جس کے بعد دوپہر کے کھانے کی باری آتی۔

ماں جی بے حد مہمان نواز تھیں۔ جب ہم بہن بھائی چھوٹے تھے تب بھی ہمارے گھر میں رمضان المبارک کے دوران دو تین بار دعوت افطار کا اہتمام ہوا کرتا تھا جس میں ابتداً پندرہ، بیس افراد پھر آخری زمانے میں ستر سے اسی افراد شریک ہونے لگے۔ ہمارے گھر کی دعوتِ افطار کی شہرت ماش کی دال کے بنے دہی بڑوں کے حوالے سے تھی۔ وہ ایک دن قبل ہی دال صاف کر کے بھگو دیتیں اور دوسرے دن سل پر پیسا کرتیں۔ یہی نہیں چھولے، پکوڑے اور فروٹ چاٹ بھی تیار کرتیں۔ زمانہ بدلا کچھ سہولتیں پیدا ہوئیں۔ ہمارے گھر بھی بلینڈر آ گیا۔ یوں دال پیسنے میں خاصی سہولت ہو گئی مگر جس قدر سہولت ہوئی تھی اسی قدر شرکائے محفل کی تعداد بھی بڑھ چکی تھیں۔

میں آج بھی سوچتا ہوں کہ وہ تن تنہا ستر اسی افراد کے لیے افطار کے لوازمات تیار کرتی تھیں۔ نماز ظہر کے بعد ہی باورچی خانہ سنبھال لیتیں اور محض نماز عصر کی ادائیگی کے لیے وقفہ ہو پاتا۔ ہم بھائی فروٹ چاٹ بنانے میں ضرور مدد کرتے اس سے زیادہ کچھ کرنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ رہی بہنوں کی بات تو وہ جیسے ہی ماں کا ہاتھ بٹانے کے لائق ہوئیں محض دو تین سال میں ہاتھ پیلے کر کے پیا گھر سدھار گئیں۔ اگر ایسی کسی دعوت کے موقع پر آ بھی جاتیں تو ان کی مدد علامتی نوعیت کی ہوتی۔

حالات بدلے، گھر کا نظم ونسق بہوؤں نے سنبھال لیا۔ مہمانوں کی تعداد بڑھی، بہوؤں کی تعداد بھی ایک دو نہیں پانچ تھی۔ مگر ان سب کے لیے مل کر بھی افطاری کی تیاری ممکن نہ رہی۔ پھر ان کے مشورے کے بعد بازاری سموسے، پکوڑے اور بریانی منگائی جانے لگی۔

والد صاحب کی وفات کے بعد والدہ صاحبہ علاقے کی خاتون کونسلر کی حیثیت سے منتخب ہو کر خدمت خلق میں جت گئیں۔ بیماروں کی عیادت کرنا ہو یا کسی مرحوم کی تعزیت کے لیے جانا، ان کا یہ معمول تھا کہ ہمہ وقت تیار رہتیں۔ پھر غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کی امداد انہوں نے اپنا مطمع نظر بنا لیا تھا۔ تعلیمی سال شروع ہوتا تو غریب اور یتیم بچوں کی درسی کتب کا انتظام کرتیں، کسی بیمار کا سنتیں تو اس کی دوادارو کے لیے پیش پیش نظر آتیں۔ رمضان کا مہینہ آیا تو غریب اور ضرورت مند گھرانوں کے چھوٹے بچوں کے لیے ریڈی میڈ سوٹ اور جوتے چپل خریدنے کا اہتمام کرتیں تا کہ غربا کے بچے بھی عید کی خوشیوں میں شامل رہیں۔ عید

قربان کے موقع پر ایک طویل فہرست ان کے پاس ہوتی جس میں اکثر ایسے گھرانے تھے جہاں قربانی نہیں ہوتی یا جہاں قربانی کا گوشت نہیں پہنچتا۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود ان کی فہرست کے مطابق ہر گھرانے تک گوشت پہنچانا ممکن نہ رہتا جس پر انہیں تاسف ہی رہتا۔

ماں جی انتہائی صابر وشاکر، قناعت پسند خاتون تھیں۔ حرص وہوس اور نام ونمود ان کے قریب سے نہ گزرتے تھے۔ وہ انتہائی سادہ زندگی گزارتی تھیں۔ اپنی بساط بھر لین دین کرتیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہمارے گھرانے کے مالی حالات کچھ زیادہ اچھے نہ تھے مگر اس دور میں بھی اقدار و روایات کی پاسداری ان کا معمول تھی۔ عید سے ایک دن قبل سویاں، چینی، چاول اور میوہ لے کر ہمیں پھوپھی کے گھر بھیجتیں۔ جب ہم پھوپھی کے گھر داخل ہوتے تو ان کے بچے ہماری پھوپھی کو چھیڑتے ہوئے کہتے لو! امی تمہاری عیدی بھی آ گئی۔ جس پر وہ بڑے مان سے کہا کرتیں، اللہ میرے بھائی بھتیجوں کو سلامت رکھے اور یہ کہتے ہوئے ہمیں گلے لگا لیتیں۔ پھوپھی کے یہاں کسی کی شادی ہو ماں جی شاداں و فرحاں بھات کا انتظام کرتیں اور پھر جب ہم اسے لے کر جاتے تو اکثر دوپٹہ اوڑھانے کی ذمہ داری میں ادا کرتا جوں ہی دوپٹہ ان کے سر پر اوڑھاتا وہ مجھ سے گلے لگ کر رونے لگتیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا کہ خوشی کے موقع پر کیسا رونا مگر پھر سمجھ بوجھ کے ساتھ یہ اندازہ ہوا کہ یہ خوشی کے آنسو ہوا کرتے تھے۔

ماں جی کے بتائے سبق کو ہم نے بھی ازبر کرلیا ہے۔ بہنوں کے بچوں کی شادیاں ہوئیں تو ہم نے بھی بھات چڑھایا اور روایت کے عین مطابق اپنے بچوں کے ذریعے دوپٹہ اوڑھانے کی ذمہ داری پوری کی۔ یہی نہیں عید کے موقع پر تہواری بھیجنے کے لیے ذمہ داری بیٹے، بیٹیوں کو تفویض کرتے ہیں۔ چند سال پہلے کی بات ہے میری بیٹی جو چھوٹی تھی ایک روز پوچھنے لگی پھوپھی کو عید پر یہ سامان کیوں بھیجتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ یہ بہنوں کا مان ہے اور بھائی خوشیوں میں اپنی بہنوں کو اس طرح یاد رکھتے ہیں۔ اس پر وہ بے ساختہ بولی جب میری شادی ہو جائے گی تو میرے بھائی بھی میرے گھر اسی طرح تہواری لایا کریں گے؟ یہ معصومانہ بات سن کر سب کھلکھلا کر ہنس دیے اور وہ حیران و پریشان سب کو دیکھنے لگی۔

ماں جی ایک بھرپور زندگی گزار رہی تھیں۔ ہمارے خاندان کی دوسری نسل میں بڑی بہن کے بچوں کی شادی طے ہوئی جس میں وہ بڑے ذوق وشوق سے شریک تھیں۔ مگر شادی کے چند دن بعد وہ بیمار ہوگئیں۔ تشخیص کے بعد اندازہ ہوا کہ کریٹائن اور یوریا بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے گردوں کی کارکردگی خاصی متاثر ہے S-I-U-T لے کر گئے کچھ علاج ہوا پھر گھر آ گئیں۔ اسی دوران چھوٹی بہن ریحانہ بھی ان کی ناسازی طبع کا سن کر اوکاڑہ سے کراچی آئی۔ پندرہ دن یہاں رہی اور واپس چلی گئی۔ طبیعت کبھی بگڑتی اور سنبھلتی رہی اور پھر عین اس دن جب رمضان المبارک کا چاند نظر آیا ان پر دل کا دورہ پڑا۔ ہسپتال لے گئے جہاں انتہائی نگہداشت کے شعبے میں چند دن رہیں۔ اس دوران ڈائلیسز کا تکلیف دہ عمل بھی شروع ہوا ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ انھیں ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھیں۔ ہم نے فوری طور پر ان کے کمرے میں ائیر کنڈیشنڈ لگوایا۔

ابھی ائیر کنڈیشنر کی کولنگ پورے طور پر نہ ہو پائی تھی کہ ان پر گھبراہٹ اور بے چینی طاری ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان پر اک بار پھر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ایمبولینس آئی، وہ ہسپتال کی طرف روانہ ہوئیں مگر قضا کے فرشتے نے اپنا کام پورا کر دیا۔

لوگ جس وقت چودھویں روزے کی سحری میں مصروف تھے ماں جی داعی اجل کو لبیک کہہ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگئیں۔ ریحانہ ایک بار پھر اوکاڑہ سے کراچی کی طرف عازمِ سفر تھی۔ وہ آئی اور متورم آنکھوں کے ساتھ چہرے کو تکتی رہی۔ وہ ساکت کھڑی تھی کہ کسی نے کفن سے چہرہ ڈھانپ دیا۔ میں نے خود نماز جنازہ پڑھائی اور پھر ان کے بیٹوں، پوتوں نے مل کر انہیں لحد میں اتارا۔ 27 ستمبر 2007ء کو خاک کے اس پتلے کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ آہ وہ ہستی چلی گئی جو ہمارے سروں پر ٹھنڈی چھاؤں کی طرح تھی۔ رب کی رحمت سے امید ہے کہ اب وہ باغ ارم میں لطف وسرور کے ساتھ موجود ہوں گی۔ انشاءاللہ (آمین)۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر ثمین ذکا

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر!

ڈاکٹر ثمین ذکا (مرحومہ) کے ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی مختصر سی کتاب ''داستانِ عطا و بخشش'' 2011 میں شائع ہوئی اس سے قبل اس کے کچھ حصے ماہنامہ ''بتول'' میں شائع ہو کر پذیرائی پا چکے تھے، بعد ازاں بقیہ ابواب بھی شائع ہوئے۔ قندِ مکرر کے طور پر اس کتاب کے کچھ حصے قسط وار دوبارہ یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔ امید ہے قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ آغاز میں کتاب کا پیش لفظ اور فلیپ دیا گیا ہے جو دونوں ایڈیشن میں شامل ہے (ص۔ا)

(ا)

محترمہ ثمین ذکا ایک دردمند معالج، ایک باہمت ماں اور ایک خدا پرست انسان ہیں۔ ان کی شخصیت کی یقیناً اور بھی قابل قدر جہتیں ہوں گی جن سے مختلف لوگ آشنا ہوں گے۔ مگر میں نے جب بھی ان کو دیکھا، پارے کی طرح متحرک اور بے چین پایا۔ جیسے اندر ہر وقت کوئی لو جلتی رہتی ہو، کوئی لگن لگی رہتی ہو اور وہ بہت کم وقت میں بہت زیادہ کر لینا چاہتی ہوں۔ ایسے لوگ ہمیشہ مجھے انسپائر کرتے ہیں۔ کئی بار دل چاہا ان کے اندر جھانک کر دیکھ سکوں وہاں کیا کچھ ہے۔ یہ آنکھوں میں جلتی لو کس دشت کی سیاحی کے سبب ہے۔ یہ گردِ مہ و سال کن راستوں، کن منزلوں کی مرہونِ منت ہے۔ مگر ہمیشہ ادب و احترام آڑے آیا اور زمانی ترتیب میں میرا خاصا بعد میں آنا اس بے تکلفی کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ اس کے باوجود یہ ان کی محبت و شفقت کے چھوٹا ہونے کے باوجود ''چھوٹے پن'' کا احساس نہیں ملتا۔

میری یہ خواہش کسی حد تک پوری ہوئی جب ''داستانِ عطاء و بخشش'' کا مسودہ میرے پاس آیا۔ اس کتاب کے لیے یہ حروف لکھنا میرے لیے اعزاز ہے۔ اپنی زندگی کے مختلف مراحل اور تجربات کو انھوں نے اس طرح قلم بند کیا ہے کہ پڑھنے والے ان میں سے بہت کچھ ایسی دلچسپی کے مطابق اخذ کریں گے۔ مگر میرے لیے وہ ایک ایسی خاتون کے طور پر سامنے آئیں جنھوں نے اپنی خوش باش، مطمئن زندگی میں شدید آزمائش دیکھی۔ پھر آزمائش کے بعد اللہ پر توکل کرنا اور اس کے فیصلوں پر راضی برضا رہنا سیکھا۔ حساس دل و دماغ اور نازک اعصاب کی مالک خاتون نے کس طرح ٹوٹتی جڑتی ہمت کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھا اور ہارنے والوں میں شامل ہونا پسند نہ کیا۔ مگر سب سے اہم بات یہ کہ اس تمام سفر میں اپنے خالق کو پہچان کر اس سے ایسا اٹوٹ رشتہ جوڑ لیا جو ان کے لیے سب سے بڑا سرمایہ ثابت ہوا۔ مالک شاید آزمائشیں اسی لیے بھیجتا ہے۔ انسان کی فطرت میں رب کی پہچان تو ہے مگر خود انسان گھوم پھر کر، لمبا راستہ لے کر رب کی طرف آنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے کہ

تم آسانی سے مجھ کو مل نہ جانا
مجھے اپنا پتہ بھی ڈھونڈنا ہے

تو ان حالات نے ان کو عرفانِ ذات جیسی نعمت عطا کر دی۔ خدا سے تعلق نے زندگی کے بارے میں رویے کو مثبت رکھا اور اللہ سے اچھی امیدیں چراغوں کی طرح راستے کے اندھیروں میں جلتی رہیں۔

سکاٹ لینڈ کے شب و روز ان کی صالح فطرت اور راست فکر کے آئینہ دار ہیں۔ وہ یورپ جہاں جا کر اکثریت دیسی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، انھیں دین کی بات کے بغیر کہیں محفل سجانا اچھا نہیں لگتا۔ یہی راست فکری مشکلات میں ان کے کام آئی۔ پھر روحانی سفر کی ابتدا ہوتی ہے تو بنت الاسلام اور ام راشد جیسی ہستیوں کا ساتھ انھیں رہبانیت سے بچا کر عملی بنائے رکھتا ہے ورنہ کئی اس دشت میں آسانی سے سرابوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔

خالق سے اسی تعلق نے ان کا تعلق مخلوق سے جوڑا اور پھر خدمت کے اس عظیم کام میں کیسے فرد سے قافلہ اور قطرے سے دریا بنا، اس کی تفاصیل ایمان افروز ہیں۔لیکن یہاں بھی در پردہ ان کا اصل رنگ جھلکتا رہا۔دوادارو کرنا تو ان کا ظاہر تھا،مگر ان کے اندر کی اصل مسیحا مخلوق کو اس بہانے خالق سے جوڑتی نظر آتی ہے۔گویا

سیکھیں ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!

وہ شاہدرہ کی بشیراں ہو یا گلاسکو کی مارگریٹ سمتھ، ان کا دل اصلی مسیحائی کے لیے مچلتا رہتا ہے، جو جسمانی بیماری وافلاس میں خزانوں کی کنجیوں جیسی ہے اور پیاسی روح کے لیے آبِ حیات جیسی!

مجھے امید ہے کہ یہ داستان پریشان خیالی اور آوارہ مزاجی کے اس دور میں.....ڈپریشن،اینگزائٹی اور ہائپر ٹینشن کے اس زمانے میں کئی پڑھنے والوں کے راستے کو آسان کرے گی، حوصلوں کو جلا بخشے گی اور زندگی کے بارے میں مثبت سوچ کو پروان چڑھائے گی۔ان شاءاللہ

(صائمہ اسما)

(۲)

سادہ اور پرخلوص الفاظ اور (۲) دل پذیر اندازِ بیان میں لکھی ہوئی یہ کتاب ایک عمدہ تصنیف ہے۔اس میں کئی منفرد خوبیاں ہیں۔واقعات کا بیان ایسا ہے کہ وہ تصویروں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب زندگی کے تینوں دنیاوی، دینی اور روحانی پہلوؤں کا مرقع ہے۔

کتاب کی مصنفہ لیڈی ڈاکٹر ثمین ذکا ''فی سبیل اللہ ٹرسٹ'' کی اُن چند ممتاز خواتین میں سے ہیں جنھوں نے اس ادارۂ کارِ خیر کی بنیاد ڈالی اور جو اس کی روح رواں ہیں۔''فی سبیل اللہ ٹرسٹ'' کے سنہری اصولوں میں ایک یہ ہے کہ ٹرسٹ اپنی تشہیر یعنی پبلسٹی بالکل نہیں کرتا۔عوام کے جن طبقات میں یہ خیر کے کام کرتا ہے وہاں سب اس سے واقف ہیں۔ تاہم ٹرسٹ کی تاریخ لکھنے کی ضرورت تھی، نئی نسل کے لیے بھی، اور اس لیے بھی کہ اس سے آگاہ ہو کے لوگوں میں خدمتِ خلق کا جذبہ اور شوق بڑھے۔

ڈاکٹر ثمین نے لاہور کے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔گھر میں سینکڑوں کتابیں تھیں، ماحول اسلامی تھا۔دونوں کے اثرات ان کی تربیت میں سما گئے۔انھوں نے میٹرک لیڈی میکلیگن گرلز ہائی سکول سے کیا،لاہور کالج فار ویمن سے ایف ایس سی (میڈیکل) پاس کیا اور فاطمہ جناح میڈیکل کالج سے ۱۹۶۳ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ایک سال گنگا رام ہسپتال میں سرجری کے شعبہ میں لگایا پھر وہ سکاٹ لینڈ چلی گئیں جہاں ان کے شوہر ڈاکٹر ذکا الدین نفسیات کے شعبے میں ایک ممتاز ڈاکٹر سمجھے جاتے تھے۔

ڈاکٹر ثمین ذکا نے ۱۹۶۷ء میں گلاسگو کے نزدیک ایک ہسپتال میں بچوں کی بیماریوں کے شعبے میں ایک سال کا ہاؤس جاب کیا۔ایک سال ووڈلی ہسپتال میں ذہنی مریضوں کی جسمانی بیماریوں کے شعبے میں لگایا، ایڈنبرا میڈیکل یونیورسٹی میں چائلڈ ہیلتھ کورس کیا، کمیونٹی ہیلتھ افسر کی حیثیت سے ڈیوٹی ادا کی اور چار سال بچوں کے کلینک اور سکولوں کے کلینک اور فارم ہیلتھ سینٹروں میں کام کیا۔چنانچہ صحت اور میڈیکل کے شعبوں میں خصوصاً بچوں کے امراض کے معاملے میں ان کا وسیع تجربہ ہے۔

اس تمام عرصہ کے دوران ان کا دینی اور روحانی رجحان اور خدمتِ خلق کا جذبہ پروان چڑھتا رہا۔جب وہ ۱۹۷۸ء میں سکاٹ لینڈ کو خیر باد کہہ کے پاکستان واپس آ گئیں تو رب علیم و کریم نے ان کی خاصیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے مواقع فراہم کر دیے۔

یہ کتاب ہر قسم اور ہر عمر کے افراد کے لیے دلچسپ اور فائدہ مند ہے۔مصنفہ نے کتاب میں جو تجربات اور واقعات پیش کیے ہیں وہ سبق آموز بھی ہیں۔پڑھنے والے کو تقویت دیتے ہیں اور اسے رب العزت کے ساتھ تعلق جوڑنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔ڈاکٹر ثمین ذکا نے کتاب میں کئی پر اثر دعائیں اور ورد اور وظیفے قلمبند کر کے لوگوں کی بھلائی کے لیے بڑا اعلیٰ کام کیا ہے۔

(کموڈور (ر) طارق مجید)

☆.....☆.....☆

کہانی کا محرک!

اس روز صبح ہی سے گھر میں خوب رونق تھی۔ قریبی رشتہ دار خدا حافظ کہنے کو جمع تھے اویس بیٹا اپنی بیگم نوشین اور دونوں بچوں ضیاء اور غازی کے ساتھ چند ہفتوں کی چھٹیاں گذار کر واپس لندن جا رہے تھے۔

ان تھوڑے سے دنوں کا پتہ ہی نہ چلا۔ بچے کبھی ننہال میں وقت گزارتے تھے اور کبھی دادی کے ہاں۔ خوشی اور رونق کا وقت بہت ہی جلدی گذرتا ہے اور اب صبح کے ساڑھے نو گھر سے روانہ ہو رہے تھے۔ سب سامان وغیرہ گاڑیوں میں رکھا جا چکا تھا۔ تو جانے والے سب کو مل کر اپنی نشستوں پر بیٹھے اور منزل کی طرف چل دیے۔ تھوڑی دیر میں ہی سب عزیز بھی رخصت ہو گئے۔

بھائی جان طارق تشریف فرما تھے ان سے مخاطب ہوئی اور کہا ''اب آپ کو بھی جانا ہوگا ضروری کام آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے'' وہ کہنے لگے 'میں کچھ دیر بیٹھتا ہوں'۔ ''کیا گلابی چائے پئیں گے''۔ 'ہاں ضرور' انہوں نے شوق سے کہا۔ بہت سی چائے تیار تھی مگر روانگی کی افراتفری میں کسی کو پوچھنے کی بھی فرصت نہ ملی۔

اچھا لگا کہ ایک مہمان تو ایسے ہیں جن کے ساتھ چائے پی جائے گی۔ اسی دوران بھائی جان پوچھنے لگے گاؤں کے کام کیسے چل رہے ہیں؟ بس ان کا یہ پوچھنا تھا کہ میں نے شاہدرہ پروجیکٹ کی خاص خاص دلچسپ باتیں بتانی شروع کر دیں۔ چند ایک روحانی قسم کے اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد کے سچے واقعات بھی سنائے۔ تو وہ آرام سے بولے ''یہ ایسی باتیں ہیں جو کہ لکھنی چاہئیں اس بارے میں سوچنا''۔

پھر وہ تو اپنے گھر روانہ ہو گئے اور میرا ذہن اسی طرح کے بہت سے پرانے واقعات کو دہرانے لگا۔ جب کئی سال پہلے پاکستان بچوں کے ساتھ واپس آئی تھی پروفیسر ڈاکٹر نبیہ حسن کو ملنے گئی (ان سے خاصی واقفیت تھی ان کی بھتیجی ڈاکٹر صادقہ عباس میری بچپن کی سہیلی ہے) سالوں بعد ڈاکٹر نبیہ حسن سے یہ میری پہلی ملاقات تھی چند باتیں ہوئیں بغور مجھے دیکھتی رہیں۔ آخر میں کہا ''ثمین تیری زندگی کی فلم بہت تیزی سے چل گئی اور جو تبدیلیاں تمہارے اندر رونما ہوئی ہیں ان کے بارے میں کبھی ضرور لکھنا۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا''۔ تھوڑے وقفہ کے بعد زور دے کر کہا۔

ہر ماہ کے پہلے پیر کو ہمارے ٹرسٹ کی میٹنگ ہوتی ہے محترمہ ام راشد سے اُس روز اگلی میٹنگ کے بارے میں فون پر باتیں ہو رہی تھیں کہ کتاب والی بات یاد آ گئی ان سے ایسے ہی سرسری ذکر کیا تو جواباً بولیں ''میں تو کئی روز سے سوچ رہی تھی کہ تمہیں کہوں اللہ کی مدد کے اتنے واقعات نظر آ رہے ہیں انہیں لکھنا چاہیے''۔ اتنا کہہ کر انہوں نے چند ایک واقعات مجھے فون پر ہی سنا دیے۔ محترمہ ام راشد ''دلوخورد'' کے پروجیکٹ کی ذمہ دار ہیں جبکہ شاہدرہ کی ذمہ داریاں زیادہ تر میرے اوپر ہیں ویسے بہت سی ذمہ دار ساتھی اللہ نے عطا کی ہوئی ہیں جو کہ ہر مرحلہ پر ساتھ دیتی ہیں۔

اب اس بات کو پورا ایک سال گذر چکا ہے اسلامی کیلنڈر کا پہلا مہینہ محرم اور 1431ھ کا سال ہے دسمبر 2009ء کا تیسرا ہفتہ ہے۔ لکھنے کا کام ذہن میں گھومتا رہا تھا مگر وہ یکسوئی حاصل نہ ہو رہی تھی پھر یہ بھی خیال آتا کہ یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد ذاتی شہرت یا نفس کی تسکین تو نہیں؟ مگر دل سے ہی جواب مل گیا کہ اس میں اللہ پر یقین رکھنے والوں کے لیے بہت سا دلچسپی کا سامان ہوگا اور کچھ سبق آموز واقعات زندگی میں آسانیاں پیدا کر دیں گے۔

بس پھر اللہ رب العزت سے اس خصوصی کام کے لیے مدد مانگنے کی دعا نے مستقل دعاؤں میں مقام بنا لیا۔ اب زندگی کی شام آ چکی ہے۔ لکھنے کی توفیق مل جائے گی تو یہ کٹھن منزل آسان ہو جائے گی۔

آغازِ سفرِ زندگی

ہماری والدہ صاحبہ کا تعلق بٹالہ سے اور والد صاحب لاہور سے تھے۔ دونوں ہی ارائیں خاندان سے تھے۔

ارائیں لوگ اس خطہ کے باشندے نہیں ہیں وہ عراق سے صدیوں پہلے مبلغین کے ساتھ اس خطۂ ارضی میں آتے رہے۔

ہماری والدہ کی اماں چھوٹی عمر میں فوت ہوگئی تھیں۔ ان کی بڑی ہمشیرہ کی شادی تیرہ سال کی عمر میں لاہور ہو چکی تھی۔ والدہ کا چھوٹا تین سال کا بھائی اور اس سے چھوٹی بہن ایک سال کی تھیں۔ ان کی دادی نے تینوں کو بہت پیار اور سلیقہ سے پالا۔ وہ خود بہت پکے ایمان والی تھیں۔ پوتے پوتیوں کی بہت اچھی تربیت کی باتوں باتوں میں زندگی کے اصول قاعدے اپنے الفاظ میں بتایا کرتی تھیں۔ والدہ تھوڑی بڑی ہوئیں تو امور خانہ داری میں دلچسپی پیدا کی۔ جب بھی کچھ فرصت ملتی تو پھوپھیوں کے ہاں سلائی کڑھائی کروشیہ وغیرہ سیکھنے بھیج دیتیں۔ دونوں پھوپھیاں رشتہ داروں میں بیاہی ہوئی تھیں اور ان کے گھر اسی محلّہ میں تھے۔ قرآن پاک نماز اور بنیادی دین کی تعلیمات بڑی پھوپھی سے ہی سیکھیں۔ ان کی دادی فارغ نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ اکثر اوقات یہ یاددھانی کراتیں ہاتھوں کو کارآمد کار میں دل کو اللہ کی یاد میں مصروف رکھو گے تو اس دنیا اور اگلی دنیا میں بھی بھلا ہوگا۔

والدہ مرحومہ کی زندگی کے آخری سالوں میں اکثر ان کی طرف رہتی تھی اور وہ بہت شوق سے اپنے بچپن اور جوانی کے حالات و واقعات سنایا کرتی تھیں۔

والد صاحب کا خاندان صدیوں سے بھاٹی گیٹ میں رہائش پذیر تھا اور وہ سید علی ہجویری کے بہت عقیدت مند تھے۔ بی۔ اے اسلامیہ کالج لاہور سے کیا۔ مطالعہ کا بہت شوق تھا خاص طور پر انگلش لٹریچر بلکہ بے شمار کتابیں اکٹھی بھی کر رکھی تھیں۔

اس زمانہ میں علامہ محمد اقبال نے بھاٹی کے بڑے بازار میں ایک بیٹھک کرایہ پر لے رکھی تھی جو کہ ہمارے دادا کے والد حاجی احمد بخش مرحوم کی تھی۔

والد صاحب کو علاّمہ محمد اقبال سے بے حد عقیدت تھی ان کے اشعار اکثر زبان پر رہتے۔ جب بی۔ اے اچھے نمبروں سے کر لیا تو علاّمہ صاحب نے نوکری کا مشورہ دیا بلکہ بڑی تاکید کے ساتھ دفتر لاٹ صاحب (سول سکریٹریٹ) بھیجا۔ محکمہ پریس برانچ کا جو انگریز انچارج تھا وہ انٹرویو لیتے ہوئے آپ کی انگریزی زبان کی وسعت سے بہت متاثر ہوا اور انہیں کلرکوں کا انچارج لگا دیا وہ خود بھی کبھی مشکل انگلش کے الفاظ کا آسان انگریزی میں ترجمہ پوچھتا تھا۔ بعد میں والد صاحب کی ترقی ہوتی رہی اور اسی محکمہ سے ڈپٹی ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے۔

والد صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بے اندازہ شوق تھا جب ریٹائر ہو گئے تو جلد ہی ''پاکستان ریویو'' کے ایڈیٹر مقرر ہو گئے یہ فیروز سنز کمپنی کا رسالہ دو زبانوں انگلش اور اُردو میں ہر ماہ شائع ہوتا تھا۔

مجھ سے دو بہنیں اور ایک بھائی بڑے ہیں ماشاءاللہ چار بھائی اور 2 بہنیں چھوٹی ہیں۔ سب سے چھوٹے دونوں بھائی جڑواں ہیں۔

بچپن میں پڑھائی کا شوق نہ تھا چھوٹے بہن بھائیوں سے کھیلنے میں زیادہ وقت گزرتا۔ تقسیم ہند سے ایک سال قبل گرمیوں کی چھٹیاں بٹالہ گزارنے گئے تو والد صاحب نے بہن پروین سے کہا جو کہ اس وقت چھٹی کلاس میں تھیں میری پڑھائی میں مدد کریں اور توجہ کریں شوق دلائیں وغیرہ وغیرہ۔

آج تک یاد ہے جب گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد دوسری کلاس کا پہلا امتحان ہوا تو سب مضامین میں اچھے نمبر آئے پھر پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ تعلیم و تربیت اور کھلونا رسالے گھر آنے لگے۔ چھٹی کے دن جب بھی فرصت ملتی تو والد صاحب ضرور پوچھتے کونسی کہانیاں پڑھیں اور نتیجہ کیا اخذ کیا۔ وقت کی اہمیت پر بہت نصیحت کرتے۔ علامہ اقبال کے اشعار سنا کر اچھا انسان بننے کے جذبات بیدار کرتے رہتے تھے۔

حلال رزق کی برکتیں

تقسیم ہند سے چند سال پہلے ہی بھاٹی گیٹ چھوڑ دیا تھا اور نیا گھر ضلع کچہری سے تھوڑا آگے بنا لیا تھا۔ دادا جی ریلویز سے ریٹائر ہو چکے تھے وہ دادی اماں کے ساتھ اسی گھر میں رہتے تھے اور بڑی پھوپھی بیوہ ہو گئیں دو بیٹیوں کے ساتھ وہ بھی یہیں رہتی تھیں۔ چھوٹے چچا عبدالرشید کو پاکستانی ایمبسی کابل میں اچھی سروس ملی ہوئی تھی وہ ملک سے باہر رہتے تھے والد صاحب نہایت محنت سے اپنی نوکری

کرتے تھے کبھی کام گھر بھی لانا پڑتا تھا۔ ساری زندگی سائیکل پر سفر کیا۔ طبیعت میں کافی سادگی تھی۔ ہر ماہ کے شروع میں تنخواہ لاتے تو سب بانٹ دیتے والدین کو بیوہ بہن، والدہ کو گھر کا خرچہ ہم سب کو تھوڑی پاکٹ منی اور اپنے لیے تھوڑی سی بچا رکھتے تھے کہ کبھی کبھار پان کھانے کو دل کرتا یا بچوں کے لیے بسکٹ لے کر آتے تھے۔

اللہ رازق ہے

ایک مرتبہ تنخواہیں ملنی بند ہوگئیں پاکستان بنے چند سال ہوئے تھے میں پانچویں میں پڑھتی تھی۔ والد صاحب کے ایک عالمِ دین سے بڑے اچھے مراسم تھے۔ وہ دعائیں بتایا کرتے تھے حفاظت کے لیے یا حافظ یا حفیظ یا سلام بتایا ہوا تھا گھر سے باہر راستہ میں خود بھی پڑھا کرتے تھے اور ہمیں بھی کہتے تھے۔ جب کچھ مالی تنگی آئی تو حافظ صاحب نے یا اللہ یا رزاق پڑھنے کو کہا بلکہ بچوں کو بھی شام کے وقت ایک ایک تسبیح پڑھنے کو کہا گیا۔ یاد ہے زندگی میں پہلی مرتبہ تسبیح سے تعارف ہوا۔ اللہ کا کرنا تین ماہ بعد اکٹھی تنخواہیں مل گئیں۔

چچا حمید کی دُکھ بھری کہانی

چچا حمید کی باتیں بچپن میں دادی اماں اور والد صاحب سے سنا کرتے تھے مگر دیکھنے کا موقعہ نہ ملا۔

چھوٹے چچا عبدالرشید نے مجھے اور بہن پروین کو دادا اور دادی کے ساتھ کابل کی سیر کو مدعو کیا۔ ان دنوں ان کے دو بچے نجمی اور انیس تھے۔ سب مل کر باغوں میں سیر کے لیے جاتے تھے۔ درخت پھلوں سے بھرے ہوتے ہمارا وقت بہت اچھا گزرا۔ کابل شہر بہت خوبصورت تھا۔

اس وقت میں پانچویں کلاس میں تھی۔ چچا حمید وہاں ہمیں ملنے آئے نہایت شفقت سے ملے۔ تعلیم کی طرف توجہ دینے کی نصیحت کرتے رہے۔

وہ نہایت ذہین اور قابل انسان تھے سات زبانیں آتی تھیں۔ فارسی اور اُردو کے شاعر بھی تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچرر تھے اور وہیں کے ایک پروفیسر کی بیٹی سے شادی ہوئی دو بچے تھے۔ لڑکی سنا ہے میری ہم عمر تھی اور بیٹا چھوٹا تھا تقسیم کے وقت چچا نے لاہور آنے کا پروگرام بنایا تو پروفیسر صاحب نے صاف انکار کر دیا نہ خود آئے اور نہ ہی بیٹی اور بچوں کو ساتھ بھیجا۔ چچا حمید اس قدر افسردہ ہوئے کہ لاہور کی بجائے کابل چلے گئے وہیں ملازمت اختیار کر لی۔ بہت سالوں بعد جب صحت خاصی خراب ہوگئی تو وہ لاہور والد صاحب کے ہاں تشریف لائے مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور بتایا کرتے تھے کہ بہت کوشش کی ہندوانڈیا جانے کی مگر کبھی ویزا نہ ملا اور نہ کبھی اپنے بچوں کو دیکھ سکے۔ درویشی کی زندگی گزاری نہ اچھا کھایا نہ اچھا پہنا جو کمایا غریبوں مسکینوں میں بانٹ دیا۔ والدہ بتایا کرتی تھیں انہوں نے میرا نام یاسمین رکھا تو جب چچا جان کو معلوم ہوا تو انہوں نے خط لکھا کہ ثمین نام رکھیں عربی نام ہے اور اس کا مطلب قیمتی ہے۔

سورہ فاتحہ باعث شفا

جب والدین کی شادی ہوئی تو یہ بھاٹی گیٹ کے اندر رہتے تھے چچا رشید ایم۔اے میں پڑھتے تھے انہیں پھیپھڑوں کی ٹی۔بی ہو گئی۔ ڈاکٹر فدا حسین فیملی ڈاکٹر تھے انہوں نے مرض کی تشخیص تو کر لی مگر اس زمانہ میں اس کا علاج نہ تھا۔ دادی اماں کو کسی بزرگ نے بتایا کہ لاعلاج بیماریاں سورہ فاتحہ کا پانی پلانے سے ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ چالیس روز باقاعدہ یہ عمل کرنا ہوتا ہے۔ فجر کی 2 سنت پڑھنے کے بعد اکتالیس (41) مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھنے کے بعد پانی پر پھونک مارنی ہوتی ہے اور سارا وقت مریض وہی پانی پیتا ہے بیشک ایسے وظائف کے اول و آخر درود شریف ۳ یا ۷ مرتبہ پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔

جب دو ماہ بعد دوبارہ X-ray ہوا تو مرض ختم ہو چکا تھا اور مریض کی شکایات (کھانسی اور بخار) بھی جاتا رہا تھا.....کبھی دادی اماں کسی وجہ سے نہ پڑھ سکتی تھیں تو والدہ پڑھا کرتی تھیں چونکہ ناغہ نہیں کرنا ہوتا۔ مجھے والدہ صاحبہ سے یہ بات معلوم ہوئی۔

لیڈی میکلیگن گرلز ہائی سکول سے میٹرک کیا۔ سکول کے زمانہ میں کھیلوں وغیرہ میں حصہ لینے کی بھی ترغیب دی جاتی تھی۔ سکول

کی نیٹ بال ٹیم میں شامل تھی اور کھیلوں میں بھی تیز بھاگنا آتا تھا۔

چھٹیوں میں گھریلو کاموں میں والدہ کا ہاتھ بٹانا، کھانا پکانا سیکھنا۔ سلائی کڑھائی وغیرہ میں وقت صَرف کرنا ہوتا تھا فارغ نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ حالانکہ گھر میں ملازمہ ہوتی اور ملازم لڑکا باہر کا سودا سلف لانے کیلیے رہتا تھا۔ والدہ کا پسندیدہ مشغلہ ملازمین کے چھوٹے بچوں کے کپڑے سینا تھا۔ عصر سے مغرب تک کا وقت اس کام کے لیے تھا۔ دوپہر کو بہت کم آرام کرتیں۔ ہمیں چھٹی کے دن بھی زیادہ دیر تک نہیں سونے دیتے تھے۔ والد صاحب کا کہنا تھا صبح کو زیادہ سونا انسان کو سست اور کاہل بنا دیتا ہے۔ والد صاحب محلّہ کے لڑکوں کو انگلش سیکھنے میں مدد دیتے مگر کبھی معاوضہ نہ لیتے تھے۔

کالج کی زندگی

لاہور کالج میں پری میڈیکل میں داخلہ ہوا۔ ان دنوں بڑی بہن ڈاکٹر تنویر فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور انہوں نے برقعہ لینا شروع کر دیا تھا۔ مگر دوسری بہن پروین نے پردہ کے خلاف بغاوت کی، والد صاحب سے کالج جانے کی مشکلات بیان کیں اور سائیکل خریدنے کی درخواست کی ہمارے والد صاحب بہت روشن خیال تھے انہوں نے سائیکل منگا دی مگر دادا جان اور والدہ نے سخت مخالفت کی آخر اس بات پر اتفاق رائے ہوا کہ چادر لے کر جائیں گی۔

میرے لیے راستہ ہموار ہو گیا مجھے آسانی سے سائیکل مل گئی ان دنوں لاہور میں ٹریفک بہت کم ہوتی تھی چند ایک کاریں ہوتی تھیں البتہ بسیں بہت چلتی تھیں رکشہ ابھی ایجاد نہ ہوا تھا۔ عوام الناس سواری کیلیے ٹانگہ استعمال کرتے تھے۔

کالج میں خاصی محنت کرنی پڑتی تھی اس لیے کھیلوں کے لیے زیادہ وقت نہ ملتا تھا البتہ بیڈمنٹن میں اچھی مہارت حاصل ہو گئی تھی مگر کالج ٹیم میں آنے سے انکار کر دیا کیونکہ میری سہیلیاں یاسمین اور زرینہ بہت پڑھاکو واقع ہوئی تھیں ہم اکٹھے بیٹھ کر لیکچر پہلے سے تیار بھی کیا کرتے تھے۔ محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ایف۔ ایس۔ سی میں فرسٹ ڈویژن آئی اور فاطمہ جناح میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تعلیمی وظیفہ ملا جو پورے پانچ سال جاری رہا۔

ان دنوں طارق بھائی جان جو مجھ سے تھوڑے ہی بڑے ہیں نیوی میں چلے گئے تھے۔ بہن تنویر نے ڈاکٹر بننے کے بعد پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور پنجاب کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر ہسپتال میں مختلف شہروں میں سروس کرتی رہیں چھوٹا بھائی طاہر ان کے پاس رہتا تھا۔ بہن پروین کی ایم۔ اے کے بعد شادی ہو گئی وہ کراچی چلی گئیں اس طرح گھر میں بڑا مجھے بنا دیا گیا چھوٹے بہن بھائیوں کے جھگڑوں میں صلح صفائی کراتی ان کی پڑھائی اور کھیل پر بھی نظر رکھتی تھی۔ اور کھانے کے دوران ان کو مفید باتیں بتایا کرتی تھی۔ مجھے والدین کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع ملا۔

اس زمانہ میں میڈیکل کالج میں طالبات کم ہوتی تھیں۔ پروفیسرز بہت دلچسپی سے پڑھاتی تھیں۔ ڈاکٹر پروفیسر بشارت یوسف اناٹومی کی تھیں اور ڈاکٹر روز مدان فزیالوجی کی پروفیسر تھیں۔ تیسرا مضمون (Bio chemistry) بائیوکیمسٹری اس زمانہ میں چھوٹا ہوتا تھا اور کلاسیں بھی تھوڑی ہوتی تھیں۔

Anatomy (اناٹمی) کا مضمون بہت پسند تھا کئی مرتبہ ٹیسٹ میں زبانی امتحان میں اول پوزیشن آجاتی تھی۔ یونیورسٹی کے امتحان میں اول آنے کے شوق میں دن رات محنت شروع کر دی خوراک اور نیند کا خیال نہ رکھا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایک روز شام کے قریب ڈائیکشین ہال سے باہر نکلے تو ایک سہیلی نے کہا نیچے نئے مردے آئے ہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ تہہ خانہ کی سیڑھیاں اُترتے تین چار فرینڈز نے ایک نظر ڈالی اور اوپر بھاگ گئیں۔ میں نے کالے خان (جوان دنوں نئے مردوں کے اندر دوائی ڈالتے تھے) کو دیکھا اور سوچا کتنی بہادری ہے اتنے مُردوں میں اکیلا انسان۔ مجھے بہت عجیب محسوس ہونے لگا۔ گھر پہنچتے بیہوش ہو گئی۔ اگلے دن ہوش آیا تو دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔

روحانی علاج سے پہلا واسطہ

والدین کے لیے یہ سخت پریشانی کا وقت تھا۔ والد صاحب

نے ڈاکٹر کے مشورہ سے دوائیاں لانے کا ارادہ ظاہر کیا تو والدہ نے منع کر دیا یہ جواب دے کر ''پھر ساری زندگی دوائیوں پر پڑی رہے گی'' انہیں ایک صوفیہ عالمہ کا پتہ تھا جو قرآن اور حدیث سے علاج کر سکتی تھیں۔ ان کے مشورہ کے مطابق جو بھی وہ سورتیں/دعائیں بتاتی تھیں والدہ پڑھنے کے بعد مجھے وہی پانی دیتیں اور کھانا بھی میرا الگ بنتا۔ سر میں مالش کے لیے تیل پر بھی وہی سورتیں دم کرتی تھیں۔ بیشک والدہ صاحبہ نے بہت محنت کی..... دو ڈھائی ماہ کے بعد دماغ کھلنا شروع ہوا تھوڑی چیزیں سمجھ آنے لگیں تو مجھے ان باجی کے پاس لے کر گئیں تا کہ خود ان سے حسبِ حال دعائیں پوچھو انہوں نے مجھے سورہ فاتحہ کا وظیفہ بتایا۔ اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف اور گیارہ مرتبہ سورہ فاتحہ گیارہ مرتبہ سورہ اخلاص اس سے استخارہ بھی کرتے ہیں اور یہ وظیفہ حاجت کیلیے بھی پڑھا جاتا ہے رات کی نماز کے آخری دو نفل پڑھتے ہوئے استخارہ یا حاجت کی نیت کرتے ہیں۔ میں نے دن میں ایک مرتبہ دعا استخارہ اور رات کو یہ وظیفہ پڑھنا شروع کیا سات دن میں دل مطمئن ہو گیا کہ مجھے ستمبر میں امتحان دینا چاہیے۔ پروفیسر صاحبان سے بات کی تو انہوں نے بھی میرے فیصلہ سے اتفاق کیا۔ بچپن میں زبان میں لکنت تھی۔ کئی الفاظ زبان ٹھیک ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے روحانی علاج باجی ہاشمی کے ذریعہ ہوا۔ سورہ طٰہٰ کی حضرت موسیٰ والی دعا بتائی۔ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِی وَیَسِّرْلِیْ اَمْرِی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِی یَفْقَهُوْا قَوْلِی۔

ترجمہ: ''اے میرے رب میرا سینہ کھول دے۔ میرا کام آسان کر دے، اور لکنت دور فرما دے (یا گرہ کھول دے) تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں''۔

میڈیکل کالج کے باقی سال بخیریت گزر گئے آخری سال میں اچھے نمبر آئے۔ سرجری میں پروفیسر سرجن احمد توفیق خان صاحب کے ساتھ ہاؤس جاب شروع کیا وہ اچھے سرجن کے ساتھ ساتھ بہت اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے۔ اچھے انسان بننے کی باتیں بھی کام کے دوران کبھی کرتے تھے۔ ڈاکٹر اور سٹوڈنٹ کے رشتہ داروں سے بھی اپنے پرائیویٹ کلینک میں فیس نہ لیتے تھے۔

ایک المناک حادثہ

ہاؤس جاب کے دوران ایک ہولناک سا حادثہ دیکھنے میں آیا۔ ایک رات میری اور مرحومہ ڈاکٹر خدیجہ عثمان کی ڈیوٹی تھی تقریباً رات کے نو بجے ایک نوجوان 23/22 سال عمر مردانہ وارڈ میں داخل ہوا ہمیں ایمرجنسی کال آئی فوراً پہنچے اس کے پیٹ کے وسط میں ایک گہرا زخم تھا جس میں سے بے اندازہ خون رواں تھا جو کسی صورت بند نہیں ہو رہا تھا۔ سرجن ڈاکٹر نثار فاطمہ کال پر تھیں وہ جلدی ہی پہنچ گئیں فوری طور پر آپریشن تھیٹر میں پہنچا کر خون کی بوتل لگائی گئی۔ پیٹ کھولنے پر معلوم ہوا پورا پیٹ خون سے بھرا پڑا ہے۔ بہت کوشش کے بعد خون کی بڑی شریان پر کٹ پکڑا گیا اس کی مرمت بھی ہوئی مگر اس دوران نوجوان کی حالت تشویش ناک ہو چکی تھی۔ خون مسلسل اس کے اندر تو جا رہا تھا مگر جو ضائع ہوا وہ بہت زیادہ تھا۔ گھنٹہ کے اندر اندر اس لڑکے نے دم توڑ دیا۔ یہ پولیس کیس بن گیا تھا۔ واقعہ یوں ہوا یہ لڑکا اپنے واقف کار کے ساتھ حجام کی دکان پر بیٹھا تھا جس سے اس لڑکے نے قرضہ لے رکھا تھا اس نے قرضہ واپس کرنے کا مطالبہ کیا یہ لڑکا ٹال مٹول کرنے لگا اس نے طیش میں آ کر حجام کی چھوٹی تیز قینچی اٹھا کر سیدھی پیٹ میں مار ڈالی۔ پیٹ کے درمیان میں بڑی رگ پر زخم ہوا یکدم بے اندازہ خون نکلا لڑکا بے ہوش ہو گیا اور اسی حالت میں گنگا رام ہسپتال کی ایمرجنسی میں داخل ہوا۔

اس کے فوت ہونے پر قتل کا مقدمہ چلا جس کی گواہی کے لیے مجھے اور ڈاکٹر خدیجہ مرحومہ کو ہائی کورٹ میں پیش ہونا تھا۔ چند ماہ بعد جب ہم وہاں پہنچے کورٹ کا ہال لوگوں سے بھرا ہوا۔ بہت سے سرکاری لوگ یونیفارم میں پولیس افسران اور جج حضرات موجود تھے۔ اس لمحہ خیال آیا ہمارے رب کی کتنی بڑی مہربانی ہے دو عورتوں کی گواہی ایک آدمی کے برابر کا قانون بنا دیا۔

ہاؤس جاب کے دوران اتنا کچھ سیکھ لیا دل چاہتا تھا سرجن ہی بن جانا چاہیے۔ مگر عملی طور پر ایک خاتون ڈاکٹر کے لیے شادی کو

کامیابی سے نبھانا اور اچھا سرجن بننا خاصہ مشکل قسم کا جوڑ ہے۔ بڑی بہن ڈاکٹر تنویر کی شادی کی بات پکی ہوئی 1964ء میں ڈاکٹر نعیم اقبال انگلستان DMRD کرنے گئے ہوئے تھے وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور حافظ قرآن بھی ہیں۔ بہن تنویر نے پردہ اپنے شوق سے کیا تھا۔ انہوں نے سفید کوٹ اور سفید نقاب خود ہی ڈیزائن کیا تھا جو کہ بعد میں جمعیت کی ڈاکٹرز نے اپنایا۔

اللہ کی شان بلند ڈاکٹر نعیم اقبال کے اہل خانہ بھی شریعت کے پابند اور غلط قسم کی رسومات کے خلاف تھے۔ نہایت دین دار قسم کے مخلص لوگ ہیں۔

ہاؤس جاب کے بعد میری بات بھی پکی ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد ذکاءالدین بھائی جان طارق کے سکول کے دوست تھے اور ان کی دونوں چھوٹی بہنوں (نسرین اور تحسین) سے میری اور چھوٹی بہن آصفہ کی دوستی تھی۔ یہ انگلستان سے ماہر نفسیات کی ڈگری لینے گئے ہوئے تھے۔ 1966ء میں پہلے بڑی بہن کی شادی ہوئی پھر میری ہوگئی۔ 2 سال پہلے بھائی جان طارق اور حمیرا بھابھی کی بھی شادی ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر ذکاء نے تمام کاغذات مکمل کیے ہوئے تھے۔ برطانیہ کی ایمبیسی میں ایک ہی انٹرویو میں ویزا مل گیا ہم اکٹھے ہی لاہور سے روانہ ہوئے چند دن لندن کی سیر کے لیے بچائے ہوئے تھے۔ ان کا گہرا دوست ڈاکٹر اعجاز شفیع اور بیگم ڈاکٹر نیلوفر ان دنوں لندن میں تھے اس لیے انہیں کے ہاں رہائش پذیر رہے۔ تھوڑے دنوں میں کافی حد تک لندن دیکھ لیا۔

سکاٹ لینڈ پہنچتے ہی ان کی نوکری شروع ہوگئی۔ وڈلی ہسپتال گلاسکو شہر سے چند میل باہر خوبصورت پہاڑیوں کے قریب ایک نفسیاتی ہسپتال تھا۔ تھوڑے دن فلیٹ کو سیٹ کرنے کے بعد ڈائریکٹر نے میرا انٹرویو لیا اور ایک عارضی جاب دینے پر راضی ہوگیا ویسے بھی مجھے بچوں کی بیماریوں میں کام کرنا تھا اور قریب کے ایک شہر میں بچوں کے وارڈ میں ہاؤس جاب بک کرالیا تھا۔

ایک سال بعد کچھ چھٹیاں تھیں چند دوستوں کے ساتھ مل کر یورپ کی سیر کو گئے۔ ڈاکٹر طاہر سعید ہارون کی نئی گاڑی میں جرمنی تک سفر کیا۔ ڈاکٹر ذکاء کی چھوٹی بہن تحسین بھی ان دنوں ہمارے پاس تھیں بعد میں ان کی شادی ڈاکٹر عبدالرزاق قاضی سے ہوئی جو ایڈنبرا سے سرجن بن رہے تھے۔

وقت تیزی سے گذرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے بیٹا اویس عطا کیا وہ ایک سال کا تھا ۱۹۶۹ء میں پاکستان چھٹیوں کے لیے آئے۔

ہمارے مذہبی عقائد ایک سے تھے مگر عملی طور پر میں تو کچھ نمازیں اور تھوڑا قرآن پاک کبھی پڑھ لیتی تھی مگر یہ کہتے تھے جب اللہ تعالیٰ کی سمجھ آئے گی تو تم سے بہتر مسلمان بنوں گا۔

☆.....☆.....☆

ماہنامہ بتول لاہور 2020ء

قصہ ایک عیدملن کا

عیدملن نو جون کو ہے.....عیدملن زوم پر ہوگی.....عیدملن آن لائن ہوگی.....عیدملن کی تیاریاں زوروشور سے جاری ہیں۔

ایسے دس بیس فقرے روزانہ ہی سابقات کے گروپ میں پڑھنے کو ملتے۔متوقع شرکا سے تعارف مانگا جارہا تھا، جمعیت میں ان کے سیشن کی بابت پوچھا اور بتایا جارہا تھا۔زوم کا لنک اور پاس ورڈ بھی اشاروں کنایوں میں دیا جارہا تھا۔

الغرض ایسی صورت حال تھی کہ ہم بیٹھے بیٹھے خیالوں میں مگن اور چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی۔جوں جوں دن قریب آرہے تھے اس بچے کی سی کیفیت ہوتی چلی گئی جس نے پہلی مرتبہ میلہ دیکھنے کے لیے شہر جانا ہو اور اسے یہ بھی معلوم نہ ہو میلہ کیسا ہوتا ہے اور شہر کسے کہتے ہیں۔خیر نو جون کی صبح طلوع ہوئی۔گروپ میں چاندرات کی مانند گہما گہمی تھی یہ اور بات ہے دن میں چاند ہوتا ہے نہ ستارے بس سورج ہوتا ہے تو اس سورج کی روشنی میں ہمیں یہی فکر لاحق تھی کہ یہ سب کیسے ہوگا۔میری سوشل میڈیا کی دنیا کا سورج واٹس ایپ سے طلوع ہوکے واٹس ایپ پر ہی غروب ہوتا ہے۔ٹویٹر سنیپ چیٹ فیس بک انسٹاگرام کے بعد زوم.....یہ بس نام کی حد تک سنا تھا۔چپکے چپکے بیٹی سے پوچھ لیتی کہ بیٹے زوم کیا ہوتا ہے؟

کیا زوم میں کوئی ہال ہوگا جس میں سب بیٹھ سکتے ہوں گے؟

زوم پر کیسے جاتے ہیں؟

بیٹی ہنستی.....افوہ اب امی کو بھی نئی نئی چیزوں کا شوق چڑھا ہوا ہے.....امی آپ نے زوم پر کیا اٹینڈ کرنا ہے؟

عیدملن.....اور فوری فوری لنک اس کے سامنے کردیا مبادا یہ توجہ بے توجہی میں نہ بدل جائے۔

ایسے میں گروپ میں ہر دو منٹ کے بعد ایک نمبر ایڈ ہونے لگا۔ٹوں ٹوں جاری تھی۔ممبرز کی بھی ایڈ ہونے کی کلیئرنس سیل لگی تھی۔میرے لیے زوم ایک ان دیکھی طلسماتی دنیا کی مانند تھی جس میں ہم سب ہوں گی مگر کیسے.....یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔مغرب سے قبل تعارف کے لیے تین سوال بھی ایڈمن کم اور دوست زیادہ صبا ناصر نے بھیج دیے۔ساتھ میں وضاحت کی گئی تھی کہ تین منٹ کے لیے مائک آپ کے پاس آئے گا اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی مائک بند کردیا جائے گا۔

میرے ننھے منے دماغ میں یہ چیز جم کے نہیں بیٹھ پارہی تھی۔خیر پھر صبا کا وائس میسج بھی تاکید مزید کے ساتھ آگیا، بالکل ایسے جیسے شادی کارڈ بھیج کے تسلی نہیں ہوتی، یاددہانی کے لیے فون کھڑکا دیا جاتا ہے۔

بیٹی کی ہر چھوٹی بڑی فرمائش بھی پوری ہورہی تھی کہ وہ کہیں عین وقت پر دغا نہ دے جائے۔

دل ہی دل میں کھد بد ہورہی تھی.....یہ زوم.....اللہ جانے مذکر ہے یا مونث.....میں جب ساری بہنیں جمع ہوں گی تو کیا صورت حال ہوگی۔بیٹی سے پوچھا تو بے نیازی سے کہا گیا، امی آپ ایک کونے میں بیٹھ جائیں۔یا حیرت صد حیرت.....اتنے چنے منے سے لیپ ٹاپ کے کس کونے میں یہ ناچیز سما سکتی ہے! معاملہ مزید الجھ گیا۔دل بس قلابازی کھانے کو تھا کہ چھوڑو پڑے یہ تمہارے بس کا روگ نہیں کہ راحیل قاضی کا گروپ میں میسج آیا، سب بہنیں نہادھولیں اور لپ اسٹک لگالیں.....یہ میسج پڑھ کے بس اپنی چیخ کا گلا گھونٹ کے وارڈروب کی طرف چھلانگ لگائی۔عید والا جوڑا شکر ہے پریس کیا ہوا تھا.....وہ لے کے واش روم میں گھس گئی۔بال بھی بنا لیے۔لپ اسٹک ہاتھ میں لے کے ٹھٹک گئی.....زوم والوں کو نظر آئے نہ آئے، گھر والے دیکھ کے کہیں گنگنانا نہ شروع کردیں۔

ادّھی راتیں سرخی لائی۔

خیر تے ہے؟

سوچا لپ اسٹک سے پہلے مزید کنفرم کر لیا جائے۔ ایک معزز گروپ ممبر سے پوچھا انہوں نے پھلجھڑی چھوڑی اور جواب دیا، اپنی طرف کا وڈیو کیمرہ اوف کر دیں۔ پھر پوچھا، کیا سمجھیں؟ ناقص سمجھ میں تو یہی آیا کہ ایک دوسرے کی زیارت کا موقع نہیں ہوگا دل کو تسلی سی ہوئی شکر ہے آواز ہی ہوگی اس لیے لپ اسٹک کو اگلی عید ملن تک اٹھا رکھا۔

ایسے میں آٹھ بج گئے تھے، لیپ ٹاپ پر زوم انسٹال ہو چکا تھا۔ اب یہ زوم آن کیسے ہوگا یہ مرحلہ باقی تھا۔

بارے خدا خدا کر کے نو بجے۔ نماز بھی جلدی سے ادا کر چکی تھی۔ بیٹی سے کہا لنک کھولو۔ بیٹی حیرانی سے بولی، نو بجے ہی؟ ابھی تو سلام دعا ہو رہی ہوگی۔ راحیل کا پیغام مل چکا تھا کہ وہ بانی جمعیت طالبات شکورہ آفتاب صاحبہ اور ڈاکٹر رخسانہ جبیں کو لے کے آئیں گی۔ بیٹی نے زوم کا لنک اور پاس ورڈ لے کے زوم اوپن کیا۔

''عید ملن سابقات جمعیت'' کے چمکتے الفاظ نے دھڑ دھڑ کرتے دل کو قابو کیا۔

امی آواز نہیں آ رہی..... بیٹی کہہ رہی تھی۔

امی جگہ نہیں ہے۔ اب اس نے لیپ ٹاپ سکرین پر نوٹیفیکیشن پڑھا۔

کہاں جگہ نہیں ہے؟ مجھے پریشانی ہوئی۔

زوم ہال میں سو کرسیوں کی گنجائش تھی سب فل ہو چکی ہیں۔ اس نے بم پھوڑا۔

مگر مجھے تو دعوت دی تھی صبا نے..... میں پریشان ہوئی۔ گروپ میں جھانکا تو صالحہ شیروانی، صائمہ اسما، زرافشاں فرحین بھی گروپ میں تھیں۔ ارے تم لوگ بھی ادھر ہو! مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔

ہاں جگہ نہیں۔

بارات چلی گئی ہمیں راکھی کے لیے چھوڑ کے۔

نہیں بھئی دلہا دلہن تو ادھر ہی ہیں۔

ارے دن میں کرسیوں پر رومال یا پرس ہی رکھ دیتے!

اب کیا کریں؟

بیٹی میری پریشانی پر بار بار لنک کھولتی مگر ''میکسیمم ہنڈرڈ'' کا طعنہ کلیجے پر لگتا۔ بیٹی سے بار بار ٹرائی ٹرائی اگین کی تلقین کرتی رہی اور وہ مجھے صبر جمیل کی..... ادھر سے توجہ پھر گروپ کی طرف کی۔ گروپ کی نانی..... میرا مطلب ہے ہر معاملہ میں آگے..... ڈیکوریشن کھانا پینا، سو معاملات ہوتے ہیں..... وہ سب صالحہ شیروانی ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے ساتھ محرومی میں دیکھ کے غم ہلکا ہوا، دوسرا ہٹ محسوس ہوئی۔ ایک دل جلا فقرہ آیا۔

دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے

صائمہ زوم ایکسپرٹ تھی اس نے شاید کوئی بندوبست کیا۔ آ جائیں سب..... مگر میرے پاس اس کے دیے نمبر اور لنک پر مسلسل ایرر کا لفظ لکھا آ رہا تھا۔ اندر سے بھی پیغام آ رہے تھے مگر رات کے گیارہ بج چکے تھے آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں۔ بیٹی نے بھی مزید کوشش سے ہاتھ اٹھا لیے۔

ویسے تک تو نہیں بنتی چار سو باراتی اکٹھے کر کے صرف سو کو لے جاؤ..... دل جلا فقرہ آیا۔

صائمہ نے کہا، قانتہ صالحہ، زرافشاں سب ادھر ہیں تو اندر کون ہیں؟

اندر جو آج گروپ میں تازہ تازہ بھرتی ہوئے ہیں!

فقرہ ہٹ ہوا۔ ہنسنے مسکرانے والی اموجیز کے تبادلے کے ساتھ ہی دل میں خدا حافظ کہہ کے موبائل سائلنٹ پر لگایا اور بستر سے کمر لگائی جو صدمہ سے ویسے ہی ٹوٹنے کو تھی۔

رات کے اذکار پڑھتے ہوئے نیند نے بھی جھپی ڈالی..... ہاں زوم کیا ہوتا ہے..... اندر کیا ہوا۔ یہ ان کو ہی معلوم جو اندر تھے۔ یہ شکر ہے وہ اندر زوم کا قید خانہ تھا اور ہم باہر..... یہ باہر بھی ملکوں باہر نہیں بس زوم سے باہر..... سمجھ سے باہر..... سمجھ میں آئے بھی کیسے، ہر چیز ہر ایک کے سمجھنے کے لیے نہیں ہوتی۔

ہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ کرونا سے حالات بدل گئے۔ دجالی مار ہے یا خدا کی، مگر طور طریقے بدل گئے.....لائف سٹائل بدل گئے۔ ترجیحات بدل گئیں اور تو اور عید ملن پارٹیاں بھی بدل گئیں۔ جس سائنس پر حضرت انسان کو غرور تھا وہ اس کے بل بوتے پر خدا بن بیٹھا تھا اسی سائنس نے اسے بے بس کر دیا۔ ہنستے بولتے وجود گھروں میں مقید ہو گئے۔ اب خوشیاں گھروں میں ہی کشید کریں۔ زمانے کے طور طریقے نئے ہوں یا پرانے سیکھے بنا گزارہ نہیں۔ ہاں سیکھ کے اسے اپنے رب کی رضا کے لیے استعمال کرو خواہ زوم کی عید ملن ہی کیوں نہ ہو! ☆

سہیلی

آج کل لاک ڈاؤن کے دنوں میں میری خصوصی توجہ اس بات پر رہی کہ بیٹی کو پنج وقتہ نماز کی عادت ڈالی جائے۔ دس سال کی ہونے کو ہے مگر ہر بار نماز کو ٹال جاتی۔ کبھی اسکول کے کام کا بہانہ تو کبھی کھیل کا یا کارٹون کا۔ یہ احساس رہا کہ بیٹے تو جلدی نماز پڑھنا سیکھ گئے تھے مگر یہ کس مٹی کی بنی تھی کہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔

جیسے ہی سکول بند ہوئے اسے پہلے چار وقت اور پھر بعد میں پانچ وقت نماز اپنے ساتھ ادا کرنے کی عادت ڈالی۔ اس بات کا میں تصور ہی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے ساتھ نماز ادا کرنے کا ایک الگ ہی مزہ آنے والا ہے۔ اس معمول کا یہ نتیجہ نکلا کہ اب مجھے نیت نہیں باندھنے دیتی جب تک خود جائے نماز بچھا کر ساتھ کھڑی نہ ہو جائے۔ اگر کہیں چلی جائے تو کہہ کر جاتی ہے نماز نہیں پڑھنا ساتھ پڑھیں گے۔ اگر میں ادا کر لوں تو منہ پھلا کر بیٹھ جاتی ہے کہ میرے بغیر کیوں ادا کی نماز۔ میرا اپنی بہن کے ساتھ نماز پڑھنے کا وہ احساس جو بچپن کی یاد میں کہیں دب کر رہ گیا تھا پھر سے جاگ گیا۔ سنتیں فرائض نوافل اور اذکار اس کا ایک الگ ہی احساس ہے جو میں ہر بار محسوس کرتی ہوں۔ ان دس سالوں میں آج سے پہلے میں نے کبھی نہ جانا کہ بیٹی کا ساتھ کس قدر حسین و خوبصورت احساس دلاتا ہے۔

ماں بیٹی تو سہیلی ہوتی ہیں اگر کوئی جانے!

(صائمہ عبدالواحد۔ کراچی)

کیا پکائیں؟

کرونا کی وبا نے جہاں تمام افراد کی زندگیوں پر اثر ڈالا ہے وہیں ایک عورت کی زندگی بھی یکسر بدل گئی ہے۔مردوں اور بچوں کی گھر میں موجودگی کی وجہ سے اس کا بیشتر وقت صفائی ستھرائی اور کاموں کو نمٹانے میں گزرنے لگا ہے تو ساتھ ہی اس وبا کے لگنے کا ڈر بھی ہے۔لہٰذا اس وبا سے دور رہنے اور اپنے گھر والوں کو اس سے بچانے کے لیے کچھ چیزیں باورچی خانہ میں موجود رہیں تاکہ روزانہ کی بنیاد پر انہیں استعمال میں لایا جاسکے مثلاً کلونجی، ادرک، دارچینی، لونگ، کھجور، شہد۔

وبا نے بہت سے گھروں کی مالی حالت پر کافی بُرا اثر ڈالا ہے اور متوسط طبقہ بھی نچلی سطح پر پہنچ گیا ہے۔کسی کی تنخواہوں میں تیس سے چالیس فیصد تک کمی ہوئی ہے تو کسی کو روزگار سے فارغ کر دیا گیا ہے۔کچھ گھرانوں میں اگر میاں بیوی دونوں کماتے تھے تو اب صرف ایک فرد کے لیے ممکن ہو رہا ہے کہ وہ کما سکے۔

ایسے میں ایک خاتون کا بہتر طریقہ سے گھر کو چلانا بھی کافی مشکل ہو گیا ہے۔بالخصوص کیا پکایا جائے کا بہت بڑا سوال کھڑا ہو گیا ہے کہ پیسے بھی کم لگیں اور گھر والے زیادہ منہ بھی نہ بنائیں۔اس لیے کم خرچ میں بننے والے توانائی بخش کھانوں کی فہرست چند ایک ترکیبوں کے ساتھ حاضر خدمت ہے۔

- لال لوبیہ کا سالن
- مونگ کی دال کے پراٹھے مع رائتہ یا ہری چٹنی
- بینگن کا بھرتہ مع پراٹھے
- آلو کی قتلیاں
- سفید لوبیہ کا سالن
- ملکہ مسور کی دال کے پراٹھے مع سلاد
- آلوؤں کے کوفتے
- منگوچیاں
- کڑی مع چاول یا روٹی
- آلو بھرے پراٹھے مع ٹماٹر کی چٹنی
- لوکی کی بھجیا
- مصالحہ بھری بھنڈیاں

میٹھے میں بیسن کی برفی، آٹے کا حلوہ، سویّاں، سوجی کا حلوہ بنایا جاسکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی چند ایک ترکیبیں بھی پیش خدمت ہیں۔

ملکہ مسور دال کے پراٹھے

بغیر بگھری دال ملکہ مسور بنا کر اسے تھوڑا سا خشک کر لیں اور اس میں آٹا، ڈیڑھ کھانے کا چمچہ قصوری میتھی ملا کر گوندھ لیں پھر اس کے پراٹھے بنالیں۔

منگوچیاں

ایک پیالی دال مونگ میں ایک پیالی پانی ڈال کر اسے بھگو دیں تقریباً دو گھنٹے کے لیے۔پھر اسے پیس لیں۔اس کے بعد اس آمیزے کو پکوڑوں کی شکل میں تل لیں اور ایک ٹرے میں پھیلا کر رکھ دیں۔

اس کے بعد کچی پیاز اور ٹماٹر لے کر اسے پیس لیں۔اس میں نمک، لال مرچ، ہلدی، پسا دھنیا ملا لیں اور تھوڑے تیل میں یہ پسی پیاز اور ٹماٹر ڈالیں اور اچھی طرح بھونیں یہاں تک کہ یہ مصالحہ تیل چھوڑنے لگے۔اب اس میں ان پکوڑوں کو ڈال دیں۔اور ساتھ میں دو پیالی پانی بھی ڈال دیں۔خیال رہے کہ چمچہ سے ہلانا نہیں ہے اور یہ پکوڑے پانی زیادہ پیتے ہیں۔لہٰذا اگر سالن پیش کرتے وقت شوربہ کم لگے تو پانی بڑھا کر

ایک ابال دیا جا سکتا ہے۔ باریک کٹی ادرک ڈال کر گرما گرم چپاتیوں کے ساتھ پیش کریں۔

آلوؤں کے کوفتے

آلوؤں کو ابال لیں، پھر اسے چھیل کر ان کا کچومر نکال لیں اور ان میں نمک، کالی مرچ، پسا گرم مصالحہ، پسی لال مرچ، باریک کٹا ہرا دھنیا اور پودینہ ملا کر اس کی گیندیں بنالیں۔ ایک پیالی میں انڈا پھینٹیں اور اس میں نمک اور کالی مرچ ڈالیں۔ اب ان گیندوں کو اس انڈے میں ڈبکی لگائیں اور پھر ان پر بریڈ کرمز لگا کر زیادہ تیل میں تل لیں۔ پیاز لال کریں اور دہی کے ساتھ پیس لیں۔ اب اس میں نمک، لال مرچ، پسا گرم مصالحہ، پسا ادرک لہسن ملا لیں۔

اب ایک پتیلی میں تھوڑا تیل ڈال کر یہ پسی پیاز اور دہی ڈالیں۔ اور خوب بھونیں۔ اس کے بعد اس میں یہ کوفتے ڈال دیں۔ چمچہ ہرگز نہیں چلانا۔ بلکہ پتیلی کو آخر میں کپڑے سے پکڑ کر ہلانا ہے اور ساتھ میں ایک پیالی پانی ڈال دیں۔ ابال آنے کے بعد چولھا بند کر دیں۔ ابلے چاول یا گھر کی پکی روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

یہ مشکل وقت ہے گزر جائے گا لیکن اللہ نے چاہا تو اس کے بعد آسانیاں آئیں گی حالات بہتر ہوں گے اور پھر گوشت، قیمہ سے بنے پکوان بھی کھائیں گے۔

☆.....☆.....☆

گوشہ تسنیم

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

کرونا کے دن!

دن رات اور موسموں کی طرح انسان کے حالات بھی بدلتے رہتے ہیں۔عقل والے ہر قسم کے حالات میں اپنا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ ان کا مقام ومرتبہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کا بھی یہی منشا ہوتا ہے کہ اچھے برے حالات کے ذریعے وہ اپنے بندوں کی جانچ پرکھ کرتا رہے کہ اس کے بندے اپنے رب کے ساتھ کیا رویہ رکھتے ہیں۔

''اور ہم اچھے برے حالات میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کرتے رہیں گے اور ہماری طرف ہی تم سب نے پلٹ کر آنا ہے'' (الانبیاء۔35)''اور ہم نے ضرور آزمانا ہے خوف، بھوک، اموال اور جانوں اور ثمرات کے نقصان میں مبتلا کر کے اور خوشخبری تو صبر کرنے والوں کے لیے ہے'' (البقرہ)۔

مومن کو ہر حال میں اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ رب العلمین اس سے راضی رہے۔خوشحالی ہو یا بدحالی وہ رب سے قربت کا متمنی رہتا ہے۔اسے اس بات کی فکر رہتی ہے کہ رب ناراض نہ ہوجائے۔ہم آج کل جن حالات سے دوچار ہیں ان میں ہمارا طرز عمل ہی بتائے گا کہ ہم اپنے رب سے کیا تعلق رکھتے ہیں یا ہم اپنے رب کی نظر میں کیا مقام رکھتے ہیں۔ساری دنیا ایک وبائی موسم میں وقت گزار رہی ہے۔یہ وقت ساری دنیا پہ ایک جیسی آزمائش بن کر آیا ہے مگر یہ وقت ہر فرد کے اپنے عقیدے، نظریے ایمان علم اور عقل وشعور کے مطابق نتیجہ خیز ہوگا۔ان حالات میں جب سارے ضروری غیر ضروری اخراجات، مشاغل، بند ہیں۔ہم کس نہج پہ سوچتے ہیں؟ گزرے وقت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جو وقت گزر رہا ہے یہ گذشتہ گزرے وقت سے بہتر ہو رہا ہے یا اس سے برا ہو رہا ہے؟ گزری عمر کی خرافات پہ ندامت ہے یا فرصت کے اس وقت کو غنیمت جان کر پہلے سے زیادہ وقت برباد کیا جا رہا ہے؟

آخرت کی فکر کرنے والے اور رب سے محبت اور قرب کی تلاش کرنے والے مومن کو غور کرنا چاہئے۔چند نکات یہ ہیں:

- جب بندے کو گناہ برے لگیں اور وہ گناہوں کی طرف لوٹنے کو ناپسند کرے تو سمجھ لے کہ یہ وقت خیر اور نیک اعمال کی قبولیت کی علامت ہے، اور موجودہ آزمائش اسے رب سے قریب کر رہی ہے۔اور جب انسان اپنے گناہ یاد کر کے غمزدہ، نادم اور حسرت زدہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی توبہ اور عبادت قبول کر لی گئی ہے۔اسے پہلے سے بہتر کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔
- رب سے قربت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بندے کا اور زیادہ عبادت، نیکیاں کرنے میں دل لگتا ہے اور نیکیوں میں تیزی اور جوش وجذبہ بڑھ جاتا ہے۔حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں: نیکی کی جزا ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی اور برائی کی سزا ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرنا ہے۔نیکیوں کے کام کو مسلسل کرتے رہنا اور ان پر ثبات انسان کے لیے خاتمہ بالخیر کا سبب بن جاتا ہے اور پھر اسے اسی حالت میں موت آتی ہے۔جو اطاعت الٰہی پر زندگی بسر کرے تو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس کو برے خاتمے یا نافرمانی پر موت آئے۔اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کی سنت ہے کہ جو جس حالت پر زندگی گزارتا ہے اسی حالت پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔جو جس حالت پر مرتا ہے اسی حالت پر اسے قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔
- مومن نیکیوں پر مضبوطی سے جمے رہنے اور تقرب الٰہی کے اعمال کرتے رہنے کے باوجود اپنے دل میں بہت زیادہ ڈرتا رہتا ہے، کہیں وہ قبولیت سے محروم نہ کر دیا جائے، یہ فکر بھی قربت الٰہی کا موجب بنتی ہے۔عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کے بارے میں پوچھا ''وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوْا وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَة'' وہ لوگ جو اللہ کے راستے میں جو کچھ بھی دیتے ہیں جبکہ ان کے

دل ڈر رہے ہوتے ہیں'' کیا یہ وہ لوگ ہیں جو شراب نوشی کرتے ہیں اور چوریاں کرتے ہیں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں اے صدیقؓ کی بیٹی،، بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو روزے رکھتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں اور صدقہ کرتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں نجانے یہ اعمال ان سے قبول کیے جائیں گے یا نہیں، تو یہی لوگ نیکیوں میں سبقت لے جانے والے ہیں۔

فرصت کے ان لمحات میں نیکی کی طرف رغبت اور ان پہ ثابت قدمی، گناہوں پہ استغفار کی کثرت ہے تو یہ رب کی خصوصی نظر عنایت ہے۔ لہٰذا قرب الٰہی کی علامات میں سے ہے کہ مخلص اپنے اعمال کو حقیر جانتے ہیں، ان کو کچھ نہیں سمجھتے نہ ان کا پرچار کرتے ہیں نہ ہی مغرور ہوتے ہیں وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کا اجر ضائع نہ ہو جائے۔ ان کا اپنے اعمال کو حقیر جاننا دراصل معرفت الٰہی اور ربانی نعمتوں کا ادراک اور اپنے گناہ اور کوتاہیوں کو یاد کرنے کی بنا پر ہوتا ہے۔

- اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس بندے کا مقام بلند ہے جس کا دل آخرت کے ساتھ معلق ہو جاتا ہے، وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہونے اور اپنے اعمال کی جوابدہی کو یاد رکھتا ہے۔ جواباً اللہ تعالیٰ بھی اسے یاد رکھتا ہے۔ (**فاذکرونی اذکرکم**) اور اسے گناہوں سے دور رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا محبوب بندہ آخرت میں عذاب سے ڈرتا ہے اس لیے صغیرہ کبیرہ گناہوں پر اپنا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت کی علامت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندے کے دل میں صالحین کو محبوب اور نافرمانوں کو ناپسندیدہ بنا دیتے ہیں۔ بندے کا اپنے تمام اعمال اللہ کے لیے خالص کر لینا اپنے خلوص میں شہرت اور ریاکاری کی ملاوٹ نہ کرنا، اپنے عمل میں مخلوق میں سے کسی کو شریک اور حصہ دار ہرگز نہ بنانا، دراصل اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بن جانا ہے۔ اپنی جان کو اور گھر والوں کی جانوں کو جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر آج کی سب سے بڑی فکرعقلمندی کی دلیل ہے ورنہ سب احمق ہیں۔

ان امتحان کے دنوں میں انسان کا برائیوں پر برقرار رہنا اور حرام کاموں کی طرف رغبت رکھنا اور شرعی واجبات فرض نمازوں وغیرہ کو چھوڑ دینا یا اپنی من مرضی کے مطابق شریعت کی پابندی کرنا، اعمال صالحہ میں پہلے کی طرح ہی سستی دکھانا اس بات کا مظہر ہے کہ بندہ وہ مخلوق ہے جس کو نہیں پتہ چلتا کہ مالک نے اسے کیوں باندھ دیا کیوں چھوڑ دیا۔ ایسا بندہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو رہا ہے اور رب نے دوستی کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا مگر اس نے اسے جھٹک دیا ہے ۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔

تو غور کرنے کا مقام ہے کہ گھر میں فرصت کا وقت کیسا گزر رہا ہے۔ صرف کھانا پینا، سونا، ٹی وی پہ فلمیں ڈرامے دیکھنا، موبائل کا بے جا استعمال نفسانی خواہشات کا غلبہ ہے۔ رب کے سامنے کھڑے ہونے سے بے فکری بڑھ گئی ہے تو اپنے رب سے دعا کی جائے کہ وہ ''دل بدل دے'' ۔ اگر فرائض میں زیادہ یکسوئی، قرآن پاک کی تلاوت میں اضافہ، اپنا محاسبہ کرتے ہوئے استغفار، بہتر سے بہترین اعمال صالح کی لگن، انفاق فی سبیل اللہ میں کشادہ دلی، گھر والوں کی اخروی کامیابی کی لگن کے ساتھ باہمی تعلقات میں نرمی آ گئی ہے، مستقبل میں رجوع الی اللہ پہ ثابت قدمی کا عزم ہے تو پھر مبارک ہو اللہ تعالیٰ سے قرب کی راہ ہموار ہو رہی ہے، گناہوں سے معافی مل رہی ہے گویا رب راضی ہو کر جنت کی بشارت دے رہا ہے۔

☆☆☆